اپنے مشفق دوست اور جوانسال
قلمکار جناب سلیم ستارا کے صاحب
کے لئے محبتوں کے ساتھ

شاہد دلنوی
15/03/11

پیاس

ایک ناول

مصنّف

شاہد دلنوی

"PIYAS" A NOVEL
BY SHAHID DELINAVI

نام ناول : پیاس
مصنف : شاہد دلنوی
سکونت : دلنہ (بارہمولہ) کشمیر
خوشنویس : فراز امروہوی
پہلا ایڈیشن : (۵۰۰) پانچ سو
مطبوعہ : ڈائمنڈ آفسیٹ پریس
ناشر : شاہد دلنوی
قیمت : پچاس روپے
لائبریری ایڈیشن : ستر روپے
سالِ اشاعت : ۱۹۹۷ء

ملنے کا پتہ

الفرقان بک سینٹر مگرمل باغ۔ سرینگر ۔ کشمیر

انتساب

اپنے کرم فرما رفیق مسعودی

اور

منتظر کے نام

میں ذاتی طور پر القرقان بک سنٹر مگرمل باغ سرینگر الطاف حسین شاہ اور ان کے برادر اکبر انجینئر مشتاق حسین شاہ صاحبان کا بے حد ممنون و مشکور رہوں جنہوں نے میری اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں ذاتی دلچسپی اور ہر ممکنہ تعاون دیا اور یہ کتاب چھپ کر منظر عام پر آسکی۔

شاہد دلنوی

۲ مارچ ۱۹۹۷ء

عروسِ خیال

عرصہ پہلے کی بات ہے، میں دیارِ غیر میں اپنوں سے جدائی کے دن کاٹ رہا تھا کہ ایسے میں مجھے اپنے دوست مولانا منظور سکندر کی طرف سے ایک طویل خط موصول ہوا۔ خط کیا ملا، پیاسے کو شبنم مل گئی۔ اپنے دوست کے اس خط کو میں نے حسبِ عادت بڑی سنجیدگی کے ساتھ پڑھا۔ ایک بار نہیں بلکہ کئی بار پڑھا۔

خط کی عبارت کچھ اس طرح آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ مجھے ہر لفظ سوز و گداز کا ایک دفتر لگا۔ خط جیسے آدھی ملاقات کا درجہ دیا گیا ہے، اکثر انسان کی تسکین کا اگر دائمی نہیں تو کم از کم عارضی سامان ضرور مہیا کر دیتا ہے برخلاف اس کے، میں کئی دن تک خود سے اُلجھتا رہا، کئی منظر آنکھوں کے سامنے آتے رہے، کئی بھولی بسری یادیں دل کے بند دروازے کھٹکھٹاتی رہیں دل کا یہ حال تھا کہ ہر لمحہ ہر پل اداسی کا راگ الاپتا رہا۔ چنانچہ انتہائی کرب میں ڈوبی ہوئی خط کی عبارت مجھ میں اس طرح گھر کر گئی کہ مجھے کسی کا زندہ پیکر نظر آنے لگا۔ ایک ایسا پیکر جو فی الحقیقت زندہ تو تھا پر بولتا نہیں تھا، چلتا پھرتا نہیں تھا۔ بس ایک ہی نشست پر ساکت، خاموشی کے عالم میں کھویا ہوا سا۔

خط کے متن کو میں نے کہانی میں تبدیل کر کے اس پیکر کو خاموشی کے

عالم سے نکالنے اور اسے زبان دینے کی ایک کوشش کی، جہاں پر مناسب سمجھا اُسے چلا یا بھی۔ ناول کے مزاج کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے سرِ دست اسے آگے ساتھ لے جانا ضروری تھا۔ البتہ یہاں خوش قسمتی میرا ساتھ دے گئی اور جہاں جہاں مجھے ایسی ضرورت محسوس ہوئی پیکر خود ہی چلتا بنا۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوا کہ پیکر آگے بڑھتا گیا اور میں بے خیالی میں خود ہی پیچھے رہ گیا۔

یوں تو اکثر ناول فرضی ہوتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ناول نگار کسی ایک پلاٹ کو لیتا ہے وہ پلاٹ چاہے کسی بھی سماج سے تعلق رکھتا ہو، کسی قوم سے متعلق ہو یا پھر کسی فردِ واحد کی روداد ہو۔ ناول نگار اُسے خیالات کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور پھر ان خیالات کو الفاظ کا لبادہ پہنا کر قارئین کو پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے اِس کام میں انہیں وقت بھی کم لگتا ہوگا۔ لیکن ”پیاس“ چونکہ عام ناولوں سے ہٹ کر ایک حقیقت پر مبنی ہے جس کا راقم خود ایک عینی شاہد ہے۔ لہٰذا اس کا پلاٹ ترتیب دینے اور اُسے پایۂ تکمیل تک لے جانے میں وقت بھی کافی صرف ہوا اور خون بھی بہت جل گیا۔

اپنے گھر سے دور انجان شہر کے انجان لوگوں میں دل کو تسکین دینے کا یہ ایک انوکھا تجربہ تھا جس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب ناول مکمل ہوا اور میرے حلق سے وہ آہ چھوٹ کر آزاد فضاؤں میں ارتعاش پیدا کر گئی جو مدّت سے میرے دل میں قید تھی۔ ناول لکھنے کے دوران جن لوگوں کی یادوں کا عمل دخل شاملِ حال رہا، وہ کوئی پرائے بھی نہ تھے۔ میر غلام محمدؔ کی یاد شدت سے ستاتی رہی، اِس لیے کہ اُنہیں دیکھے ایک لمبی مدّت گزری ہے۔ خدا سلامت رکھے جب سامنے ہوتے ہیں تو بڑے مزے کی باتیں سُناتے ہیں۔

مرزا قاسم صاحب کی یاد ایسے چونکا دیتی ہے جیسے خلیفۂ بغداد ہارون رشید کے محل میں اچانک ابوالحسن کو دیکھ کر درباری چونک اٹھتے ہوں گے۔ اُن کے شیخ چلّی

والے منصوبے یاد آکر پژمردہ ہونٹوں پر خود بخود تبسم آجاتا ہے۔

اپنے کرم فرما بھائی ڈاکٹر رفیق اور بہن منتظر کی جدائی میں دل خون کے آنسو روتا رہا۔ اُن کے ساتھ کئی امیدیں وابستہ تھیں لیکن اب یادوں کی تمنا نظر کی حد بن گئی ہے۔ زبان کیا کھُلے گی اور قلم کیا لکھے گا؟ سوائے اس کے کہ ؎

تنہا طے کرنا ہے سب کو رات کا لمبا سفر
جھاڑیوں میں جگنوؤں کے قافلے کھو جائینگے

مولانا صاحب کی یاد تو دل و دماغ کو گھیرے ہوئے تھی ہی اُن کی قسمت سے تو ہر ایک کو بیر ہو گا جو افسانے کی آرزو کریں اور حقیقت کو روبرو پائیں۔

بہر حال ناول "پیاس" آپ کے ہاتھوں میں ہے، مجھے امید ہے کہ آپ اسے پڑھ کر یقیناً محظوظ ہوں گے۔ اپنی قیمتی آراء سے نوازنا نہ بھولیے گا۔

شاہد دلنوی

دلنہ (بارہمولہ)

یکم مئی ۱۹۹۴ء

ایک

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی عورت کو ایک جیون ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کا قصیدہ دن رات پڑھا کرے، تنہائی میں پہروں اس کے ساتھ باتیں کرے، پیار کی باتیں، عشق کی باتیں، اس کی جوانی کے گیت گائے، اس کے لیے تڑپے اور سرِ عام یہ اعلان کرتا پھرے کہ وہ اس کے ساتھ پیار کرتا ہے۔

اپنی جوانی کے سولویں سال میں قدم رکھتے ہی کچھ ایسی ہی طلب ساجدہ کو بھی محسوس ہوئی تھی۔ یہ احساس چند ہی دن ہوئے اس کے دل میں بیدار ہوا تھا۔ لیکن اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے صدیوں سے وہ اس احساس تلے دبی جا رہی ہو۔ اپنی ابھرتی جوانی کا بوجھ بھی اس سے اٹھائے نہیں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے اندر ایک لطیف سا درد محسوس کر رہی تھی۔ اپنی اس کیفیت کو وہ کسی سے اظہار کرنے کی بھی اپنے میں ہمت نہ پا رہی تھی۔ کہے تو کس سے کہے؟ اور اگر کوئی سننے والا ہو بھی تو وہ کن الفاظ میں اس کیفیت کو ظاہر کرے۔ کئی دنوں سے اس نے کھانا بھی اچھی طرح سے نہ کھایا تھا۔ طبیعت ہی نہ چاہ رہی تھی۔ کسی کام میں گھر والوں کا ہاتھ بٹانے کا تو سوال ہی نہ تھا اور ستم بالائے ستم، کمزور ہونے کے بجائے اس کے چہرے کی لالی اور گہری ہوتی جا رہی تھی۔ جسم کچھ اور بھاری ہوتا جا

رہا تھا۔

دن اور رات میں کئی کئی بار اس کا دل چاہتا کہ وہ قہقہے لگائے، زور، زور سے ہنسے یا پھر بلک بلک کر روئے۔ کئی کئی بار وہ ایسا کرتی بھی تھی لیکن دل کا بوجھ اور بڑھتا گیا۔ ہنسنا یا رونا کسی کام نہ آیا بلکہ اس سے درد کی کسک زیادہ ہی بڑھتی نظر آرہی تھی۔

بے وجہ ہنسنے یا رونے سے جب کوئی بات بنتی نظر نہ آئی تو اُس نے ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ اب اسے رات بھر تو سونا تھا ہی، دن بھی نیند کی نذر کرنے لگی۔ دماغ نے جب مسلسل سوچنے کی راہ اختیار کی تو کثرت سے خواب آنے لگے چنانچہ خواب ہی وہ سرچشمہ ہے جس سے ہر کوئی جب چاہے اپنی پیاس بجھا سکتا ہے اور کوئی روکنے والا نہیں ہوتا۔

رات میں خواب دیکھنا تو ایک قدرتی بات ہے لیکن ساجدہ اب دن میں بھی کئی کئی خواب یکے بعد دیگرے دیکھنے لگی۔ حالانکہ اِن کی تعبیر نفی کے برابر ہی ہوا کرتی، پھر بھی اُسے اپنا خاموش درد اِن کے ساتھ بٹتا نظر آنے لگا تھا۔ وہ کچھ کچھ مسرور تھی اور کچھ کچھ اداس بھی۔ گھر میں کام کی آزادی تو تھی ہی اور اگر کبھی کوئی کام پڑتا بھی تھا تو وہ اپنی چھوٹی بہن شمی سے کہہ کر کروا لیتی۔ اس طرح آرام سے لیٹ جانے کا اُسے خاصا موقع ہاتھ آجاتا۔

زیادہ دیر تک سونے اور لگاتار خواب دیکھنے سے اُس کا حُسن کچھ زیادہ ہی نکھر آیا۔ اب اس کا دل ایک نامعلوم سی کُریدمحسوس کر رہا تھا۔ سردست اسے سہارے کی طلب تھی، لیکن سہارا دے تو کون دے۔ وہ لڑکھڑا رہی تھی، بل کھا رہی تھی۔ گرتی تھی اور کوئی ایسا نہ تھا جو اس کے دل میں جھانک سکتا کہ اُسے کیا چاہیئے؟ کئی روز سے اس کی ماں بھی پریشان تھی۔ کیوں نہ ہوتی جوان بیٹی کا غم

ماں نہ سمجھے تو کون سمجھے۔ اس نے کئی بار ساجدہ کو خود سے ہی روتے اور ہنستے دیکھا تھا بہت دفعہ اس کو بے حس و حرکت پا کر اس کے اوپر رضائی ڈال دی تھی۔ اکثر اوقات بیٹی کی پریشانی بھانپ کر سوچ کے گہرے سمندر میں غوطہ زن ہوئی تھی۔ بڑی تجربہ کار تھی، معلوم ہوا تھا کہ جوان ساجدہ کی یہ حالت کیوں ہوئی ہے۔ لیکن یہ جان کر بھی کہ اُسے ایک جیون ساتھی کی ضرورت ہے اپنے میاں سے کبھی راز افشاں نہ کیا تھا۔ گھر کی حالت بھی مدّنظر تھی۔ میاں دن رات ایک کر کے ان سب کا پیٹ پال رہے تھے۔ ضرورت کی اشیاء کے لیے بھی کئی کئی روز تڑپنا پڑتا۔ لٰہذا وہ فی الفور کوئی بھی ایسا قدم نہ اٹھا سکتی تھی جس سے ساجدہ کا غم دور ہو سکتا۔

کئی بار اس نے ساجدہ کو زیادہ سونے سے منع بھی کیا تھا۔ اور گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کی بھی تلقین کی تھی لیکن اثر کچھ بھی نہ ہوا۔ ساجدہ تھی کہ ٹس سے مس بھی نہ ہوئی۔

سینے کے اندر جلتی ہوئی اس خاموش آگ نے اُسے ایک پتھر کی مورت بنا کے چھوڑا تھا۔ اب وہ بہت کم بولتی تھی۔ گھر میں والدین اور شمی کے علاوہ اُس کی بڑی بہن سائرہ جو شادی شدہ تھی کا بھی کبھی کبھی آنا جانا تھا اور دو چھوٹے چھوٹے بھائی بھی تھے جو ابھی بچپن کی منزلوں کو ہی طے کر رہے تھے۔ اپنا غم غلط کرنے کی خاطر وہ اکثر اوقات ان سے چھیڑ چھاڑ کرتی تھی لیکن بوجھ کم نہ ہوتے دیکھ کر اکتا جاتی پھر یا تو انہیں مفت کی مار کھانی پڑتی یا خود چھپ چھپ کر رونے لگتی۔

اپنا غم غلط کرنے کی خاطر وہ پہلے ہی سے کسی کے سامنے دل کھول کر دکھانے کی آرزو مند تھی لیکن آخر کس کے سامنے؟ یہ سوال اسے اور بھی تڑپا دیتا تھا۔ ماں سے کئی بار اگرچہ باطنی صورت حال پردے میں رکھی، اپنی ظاہری حالت بیان کر ڈالی اور اس نے ہوں، ہاں میں ٹال کر تشفی دی تھی۔ یوں تو ایک وہ ہی تھی جو اُس کی

حالت سے واقف تھی اور تنہائی میں بیٹی کی اس حالت پر ایک آدھ بار غور کر کے خدا سے اس کی تسکین کی خاطر دعا کرتی۔ اور اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ ہاں اپنی اولاد کا غم محسوس کر سکتی ہے اسے دور کرنے کی خدا سے دعا کر سکتی ہے، آنسو بہا سکتی ہے لیکن اُسے اپنے اندر جذب تو نہیں کر سکتی۔

سائرہ جب سال بھر کے بعد میکے آئی تو ساجدہ کی حالت دیکھ کر تلملا اٹھی، اپنی بہن کو گرد و پیش سے بے خبر پا کر اور اپنی ہی دھن میں مست دیکھ کر اُسے اپنا بچپن یاد آنے لگا جس میں بھوک اور غریبی کے سوا کچھ نہ رکھا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ دن بھر کھیتوں میں کام کیا کرتی تھی۔ سال بھر میں ایک بار نئے کپڑوں کا منہ دیکھنا نصیب ہوتا۔ ورنہ اکثر پھٹے پرانے کپڑے اوڑھ کر ہی زندگی کے دن پورے کرنے پڑتے اور جب وہ سنِ بلوغ کو پہونچ گئی تھی تو جسم پر جگہ جگہ پھٹے ہوئے کپڑوں اور افلاس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھی ایک ساتھی کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ ایک مرد ساتھی کی ضرورت کو۔ جو اس کی ابھرنے والی جوانی کے بوجھ کو سنبھال سکتا، اُسے اپنے سینے کے ساتھ اس زور سے لگا لیتا کہ اس کی پسلیاں دُکھنے لگتیں۔ یہ احساس جاگتے ہی اس نے احمد کو نظروں کا تیر پھینک کے زخمی کر دیا تھا۔ احمد کئی دن تک منہ بسورتا رہا۔ لیکن بالآخر جب اُس نے اُن پھٹے پُرانے کپڑوں میں ہی سائرہ کے خوب صورت اور دلکش بدن کو دیکھا تو وہ اس کا گرویدہ ہو ہی گیا تھا۔

اس کے بعد وہ پاس پاس آگئے تھے۔ سائرہ پھولے نہ سمائی تھی۔ خوش کیوں نہ ہوتی وہ، احمد جو اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ وہاں پہونچ کر اُسے نہ اتنی محنت کرنی پڑتی جو وہ اپنے گھر میں کرتی تھی اور نہ ہی کبھی بھوکے رہنے کا سوال تھا۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ احمد مضبوط اور طاقت ور جسم کا مالک تھا جس کی ہر عورت کو خواہش ہوتی ہے۔ عورت ہمیشہ یہی چاہتی ہے کہ اس کا چاہنے والا مضبوط جسم کا مالک ہو، تاکہ وہ

اس کی باہوں میں آکر سمٹ جائے اور اس کی پسلیاں دکھنے لگیں۔

احمد چاہتا تو ایک سے بڑھ کر ایک بیوی اُسے مِل سکتی تھی لیکن سائرہ نے وہ جادو جگایا کہ وہ جذبات کے دریا میں ایک تنکے کی طرح بہتا چلا گیا۔ پھر جب اُس نے سائرہ کو عشق کی آنکھ سے دیکھا تو اُسے وہ دنیا کی خوب صورت ترین لڑکی دکھائی دی حقیقی معنوں میں وہ تھی بھی خوب صورت۔ علاوہ ازیں جو چیز انسان کی اپنی نظروں سے اس کے دل میں سما جائے وہ اس وقت تک نہیں مٹتی جب تک انسان اُسے خود مٹانے کی کوشش نہ کرے۔

سائرہ احمد سے سرِ عام ملنے لگی۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ وہ دن بھر ایک دوسرے سے پیار بانٹتے نظر آئے تو لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں بیلسیوں نے دعویٰ کیا کہ دونوں میں ناجائز تعلقات ہیں۔ احمد کے گھر والوں نے اُسے بہت سمجھایا بجھایا کہ خاندان کی ناک مت کاٹو، لیکن سائرہ کا پیار پتھر کی لکیر کی طرح اس کے دل میں بس گیا تھا مِٹ ہی نہ سکا۔ پانی سر سے اُوپر جاتے دیکھ کر دونوں گھرانے رشتہ جوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اور بالآخر دونوں کو شادی کے مقدس بندھن میں باندھ دیا گیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ شادی شرعی لحاظ سے واجب بھی تھی یا نہیں۔ لیکن لوگوں کا منہ بند رکھنے کے لیے فی الوقت یہ ایک ضروری امر تھا۔

ہوا کے تیز جھونکے کی طرح یہ خیالات سائرہ کے دماغ تک آئے چلے گئے ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔ اب تو وہ تین چھوٹے چھوٹے بچوں کی ماں تھی۔ اور عمر کی کئی منزلیں بھی طے کر چکی تھی۔ چند ہی لمحات میں اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور حلق سے ایک لمبی آہ کو چھوڑتے ہوئے سنجیدگی کے ساتھ اپنی چھوٹی بہن ساجدہ کی طرف متوجہ ہو گئی جو بُت بنی اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔

سائرہ کو یہ محسوس کرنے میں دیر نہ لگی کہ آج اس کی بہن کی حالت ویسی

ہی تھی جیسی خود احمد کو پانے سے پہلے اس کی تھی اور تجربے کی بنا پر وہ یہ کہہ سکتی تھی کہ ساجدہ نے ابھی تک دل کا درد کسی سے بانٹا نہیں ہے۔

سائرہ نے چاہا بھی اور اپنی چاہت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی بہن کے زخموں کو کریدا بھی، تاکہ وہ یہ راز جان سکے۔ لیکن اس نے فقط یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ بیمار ہے۔ وہ چاہتی تو بتا بھی سکتی تھی کیونکہ اُسے خود بھی یہ تمنّا تھی کہ کوئی اُس کے دل کا حال جانے مگر ایک طرف شرم و حیا اور دوسری اور بڑی بہن کی عزّت، دیوار بن کر سامنے آگئی اور پھر تیسری بات یہ بھی تھی کہ ابھی اس کی نگاہوں نے کسی کا انتخاب نہ کیا تھا۔ پھر اگر وہ کہتی بھی تو بس اتنا کہ وہ کسی انجانے درد سے دوچار ہے۔ درد کس نے دیا تھا اس چیز کا علم خود اُسے بھی نہ تھا لہٰذا بات یہیں پہ آکر رک گئی۔

اب اگر ساجدہ چاہتی تو اپنی چھوٹی بہن شمیم سے راز کی باتیں کرتی۔ اکثر اوقات اس نے ایسا چاہا بھی تھا لیکن جب وہ بھی سامنے آجاتی تو ساجدہ کو اس کی معصومیت کا خیال آجاتا، وہ سوچتی کہ شمیم ابھی سنِ بلوغ کو نہیں پہونچی ہے اس پر تو میری باتوں کا کوئی اثر نہ ہوگا اور نہ وہ میرے واسطے کچھ کر سکے گی۔ یہ کرنے اور نہ کرنے کا سوال تو دوسرا تھا، کبھی کبھی وہ یہ بھی سوچتی تھی۔ مگر منہ میں دونوں کے زبان نہ تھی حالانکہ بہن کی حالت تو شمیم سے بھی چھپی نہ تھی۔

اس ماحول میں رہ کر روز بہ روز ساجدہ کا دم گھٹنے لگا۔ وہ ذہنی طور پر بیمار تھی۔ اُس کو اِس بات کا زیادہ افسوس ہو رہا تھا کہ اس کے دردِ نہاں کی کسی کو خبر نہیں ہے۔ ذہن کی اس کشمکش میں مبتلا ہو کر اب کئی دنوں سے آنکھوں سے اُس کی نیند چھوٹ گئی تھی۔ رات بھر وہ اپنے کمرے کا چکر کاٹتی رہتی اور ستم ظریفی یہ کہ اتفاق سے ماں کے کہنے پر شمیم بھی اسی کمرے میں سوتی اور جب اچانک کسی چیز کے لڑھکنے کی آواز دورانِ نیند اس کے کانوں تک پہونچتی تو وہ ہڑبڑا کر جاگ جاتی۔ آنکھ کھلتے ہی جب وہ ساجدہ کو

بیدار پاتی تو اُسے بہت ہی دُکھ ہوتا۔ بہت دنوں تک اس نے زبان نہ کھولی لیکن صبر کی بھی حد ہوتی ہے۔ ایک رات کو جب تین دفعہ وہ پہلے ہی کی طرح جاگ اٹھی تو تینوں بار اس نے ساجدہ کو کمرے کا چکر کاٹتے پایا تو شدتِ غم سے اس کی آنکھ بھر آئی اور رندھے ہوئے گلے سے اس نے پوچھا۔

"دیدی تمہیں ہو کیا گیا ہے، یہ رات رات بھر جاگتے رہنا کہاں کی عقل مندی ہے۔"

"مجھے موت کیوں نہیں آتی شمی!" ساجدہ نے کھڑکی کے قریب آکر اس کے کواڑ کھولتے ہوئے الٹا سوال کیا اور باہر جھانک کر خلاؤں کو گھورنے لگی۔

شمی یہ سُن کر ایک دم بستر چھوڑ کر اٹھی اور ساجدہ کے قریب آکر اس زور سے سِسکی جیسے کسی نے اس کے سینے پر کلہاڑی ماری ہو۔

"اللہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو، تمہیں کون سا غم اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔" وہ سِسک سِسک کر بولی۔ اور ساجدہ جو خود کسی نامعلوم غم سے نڈھال ہو رہی تھی، بہن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر آب دیدہ ہو گئی۔ وفورِ جذبات سے اس کی آنکھ نم ہوئی اور بطورِ شکوہ وہ بمشکل تمام کہہ گئی

"شمی ایک مدت سے میں کسی نامعلوم درد میں مبتلا ہوں۔ میرا دل زندگی سے بیزار ہو گیا ہے، میرے بدن کا انگ انگ جل رہا ہے اور اس پہ ستم یہ کہ کوئی مجھ سے پوچھتا بھی نہیں کہ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ کسی کو میرے دردِ نہاں کی خبر نہیں ہے، تمہیں بھی نہیں۔ تم نے بھی کبھی مجھ سے نہ پوچھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔"

"معلوم ہے دیدی، میں تم سے اگر نہ پوچھ سکی لیکن کئی بار تمہاری حالت ماں کو یاد دلائی، اور جب وہ ہوں ہاں، میں ٹال گئی تو بابا سے ذکر کیا۔ وہ کل شام کو تمہیں کسی اچھے سے ڈاکٹر کے پاس لے جا کر تمہارا معائنہ کروائیں گے۔" وہ آنکھوں

میں آئے ہوئے آنسوؤں کو سکھاتے ہوئے بولی، اور ساجدہ نے اُسے اپنے قریب پاکر جسم کا بوجھ اُسی پر ڈال کر بڑے ہی دُکھ بھرے انداز میں پوچھا۔

"اگر میری ٹانگ یا جسم کا کوئی حصہ ٹوٹ گیا ہوتا تو بے شک کوئی ڈاکٹر میرا علاج کر لیتا، لیکن جب مجھے خود یہ معلوم نہیں کہ مجھے کیا ہو گیا ہے تو وہ کیا کر سکتا ہے مجھے ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا ہے، کہہ دینا بابا سے۔"

"اچھا آؤ سولیں ــــ" شمی نے اُسے بستر کی طرف کھینچ لاتے ہوئے کہا۔ "یہ کل کی باتیں ہیں ان پر کل غور کیا جائے گا۔" اور ساجدہ اُس کے ساتھ بستر تک چلی آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، دونوں کی آنکھیں نم تھیں۔ ساجدہ اس کے زانوں پر سر رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اور شمی دیر تک اُس کے بالوں میں اپنی نرم گرم، ملائم انگلیاں پھیرتی رہی۔

دو

ڈاکٹر نے ساجدہ کا معائنہ کرنے کے بعد چند ہلکی پھلکی دوائیں تجویز کیں اور اس کی ابھرتی ہوئی جوانی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے والد کو جلد از جلد اس کی شادی کا مشورہ دیا۔ حالانکہ اس نے شادی کا تذکرہ بڑے ہی رازدارانہ طریقے سے کیا۔ لیکن حساس ساجدہ نے ایک دم سمجھ لیا اور اس نئے لفظ کو سن کر اس کا دل بلّیوں اچھلنے لگا تھا۔ وقت کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ اس کی جوانی کا بوجھ کسی کو سونپ دیا جائے لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کے والد کے پاس اتنا اثاثہ نہ تھا کہ فی الفور اس کی شادی کہیں طے کرتے ایسی ہی مشکل انہیں سائرہ کی شادی کے وقت بھی پیش آئی تھی لیکن چونکہ وہاں احمد آڑے آیا تھا اور اس نے محبّت کا پاس کرتے ہوئے چوری چھپے اپنے ساس سسر کی مالی امداد کی تھی اور وہ اس قابل ہوئے تھے کہ بیٹی کے لیے چند جوڑے اور چھوٹے موٹے دیگر اخراجات پورے کر سکیں اور جوں توں کر کے وہ شادی ہو کر رہی تھی۔ مگر وہ معاملہ دوسرا تھا۔ اس میں کسی کی چاہت کا ہاتھ تھا اور اُسی چاہت کا لحاظ کرتے ہوئے دولہا دلہن کو اپنے گھر لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ پہلے پہلے سائرہ کا باپ اس کی بے حیائی دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا تھا اور کئی بار بچاری سائرہ پر مار پیٹ کی نوبت بھی آئی تھی۔ کیوں نہ آتی۔ اس کا باپ جہاں سے بھی ہو کر گزرتا لوگ اس کی بے غیرتی پر حقارت سے تھوکتے، اور کہتے کہ کم ذات باگی لڑکی کو قابو میں رکھنے کی ہمّت بھی

نہیں رکھتا۔ سماج میں ہر طرف سے اس پر انگلیاں اٹھائی جا رہی تھیں۔ کسی کا بس چلتا تو وہ ایک آدھ گالی دینے سے بھی نہ ہچکچاتا اور وہ زہر کے یہ کڑوے گھونٹ اس وقت تک پیتا رہا جب تک سائرہ کی شادی نہ ہو گئی۔

سائرہ کے سسرال جانے کے بعد ایک دن اس کے باپ نے ٹھنڈے دل سے سوچا تو جسے وہ اس کی بیوقوفی اور بے حیائی سمجھ رہا تھا وہ دراصل سائرہ کی سمجھ داری تھی کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے اپنے والدین کی تنگ دستی کو محسوس کیا ہوگا اور یہ سوچ کر احمد پر ڈورے ڈالے ہوں گے کہ شاید وہ عمر کے تقاضے کا لحاظ کرتے ہوئے شادی کے بندھن میں نہ بندھ سکے گی۔ یہ تھی بھی حقیقت، سائرہ چاہتی بھی تب بھی اس کے والدین اس کی خانہ آبادی نہ کر سکتے تھے۔ وہ مشکل سے دن رات ایک کر کے اپنا پیٹ تک نہ بھر سکتے تھے، اس کی بے دردی سے ضائع ہونے والی عمر کا پاس کیسے کر لیتے۔

یہ حقیقت سائرہ کے باپ کی سمجھ میں اسی دن آئی جس دن اسے سسرال گئے کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ صحیح معنوں میں وہ اس قابل نہ تھا کہ بیٹی کی شادی اپنے بل بوتے پر کہیں طے کر سکتا، سائرہ نے اپنا جیون ساتھی تلاش کر کے اور پھر زندگی بھر کے پیمانِ وفا اس کے ساتھ باندھ کے نہ صرف خود پر بلکہ اپنے والدین پر بھی ایک احسان کیا تھا۔ ایک ایسا احسان جو انسان اپنے ہی آپ پر کرے پھر بھی کسی اور کو راحت پہونچے۔

ساجدہ کی شادی کا ذکر ڈاکٹر سے سن کر وہ ایک بار پھر اسی احسان کی تلاش میں تھا کیونکہ آج بھی اس کے گھر کی حالت ویسی ہی تھی جیسی پہلے تھی۔ آج بھی وہ اس قابل نہ تھا کہ اپنی بیٹی کو سجا سنوار کر ڈولی میں بٹھا سکتا۔ اور ساتھ میں حسبِ دستور ڈھیر سارا جہیز دے سکتا۔ گھر آ کر وہ سر تھام کے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے۔ کئی خیالات اس کے ذہن کے دروازے کھٹکھٹاتے رہے۔ کئی خواب اس کی آنکھوں تک آئے چلے گئے۔ کیا وہ اپنی ساجدہ سے وہی سب کچھ کروانا چاہتا ہے جو سات آٹھ برس پہلے

سائرہ کر چکی تھی؟ اس صورت میں تو...... سائرہ کا زمانہ اور تھا۔ لوگ کوئی بات ایک کان سے سُنتے تو دوسرے کان سے چھوڑ دیتے تھے۔ کسی کا بُرا بھی دیکھتے تو پردہ کرتے مگر آج تو وہ بات نہیں، لوگ رائی کا پہاڑ بناتے ہیں۔ کسی کی ایک بات بُری سنتے ہیں تو دس اپنی ملاتے ہیں۔ اور اگر ساجدہ سے کوئی چوک ہو گئی، تو سماج میں کون سا منہ دکھا سکیں گے۔ بدنامی کے ڈر سے وہ کانپ اُٹھا۔ اور اس نے یہ خیال وہیں پر دفنا دیا، جہاں سے اس نے ابھرنے کی کوشش کی تھی۔

کئی لمحات خاموشی کی نذر ہو گئے۔ دماغ میں خیالات کا ہیجان برپا تھا کرے، تو کیا کرے، اب بھی ایک سوال شدّت پکڑے ہوئے تھا کہ کسی کی آواز کا ہتھوڑا اس کی سماعت سے ٹکرا گیا۔

"اس طرح گم سم بیٹھے کیا سوچ رہے ہو؟" یہ اس کی بیوی تھی جو ابھی ابھی کمرے کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر ایک لمبی آہ اس کے حلق سے پھوٹ پڑی۔

"بیگم......!"

بیوی آہستہ قدمی سے قریب آکر بیٹھ گئی تو اس نے نہایت ہی دُکھ بھرے انداز میں کہنا شروع کیا۔

"ڈاکٹر نے ساجدہ کی شادی جلد از جلد کر دینے کا مشورہ دیا ہے۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ کیا کیا جائے۔ یہ وہ زمانہ بھی نہیں کہ اُسے اپنا وَر خود تلاش کرنے کی آزادی دی جائے اور ادھر ہاتھ بھی تنگ ہے جو کسی سے نسبت ٹھہرا سکوں۔"

"شادی تو خیر اس کی واجب ہے چاہے اِس طرح ہو یا اُس طرح۔ جوان بیٹی ہے کب تک اس آگ کو سر پر جلتا دیکھ سکیں گے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا نا!"

"لیکن کیا۔۔۔؟ کیا تم یہ نہیں دیکھ رہی ہو کہ ہماری آمدن کیا ہے؟ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے کب قابل ہو سکوں گا۔ مشکل سے تم سب کا پیٹ پال رہا ہوں۔"

"اور ہمارے جیسے لاکھوں کروڑوں لوگ جو اس دنیا میں زندہ رہ رہے ہیں وہ کیا کرتے ہوں گے۔ کیا تم نے کبھی نہیں سوچا۔۔۔؟" بیگم نے سوال کیا۔

"اپنی زندگی کو دیکھ کر، جو اس قدر مفلسی میں گذر رہی ہے، مجھے دنیا کی ہر بات ہیچ معلوم ہو رہی ہے۔ کبھی اگر میں نے یہ سوچنے کی کوشش کی بھی کہ میرے جیسے افلاس کے مارے کیا کر رہے ہوں گے تو میرے گھر کی حالت اس خیال پر ہر طرف چھا گئی۔"

"خیر پریشان ہونے کی ابھی اتنی ضرورت نہیں ہے۔ خدا سب کا بھلا کرنے والا ہے۔ ہمارا بھی کرے گا۔ ابھی ہماری بیٹی کی عمر ہی کیا ہے۔ ایک دو سال میں ہو ہی جائے گی اس کی شادی۔"

ساجدہ کا باپ بیوی کی بات سُن کر اگرچہ مطمئن نہ ہو سکا۔ پھر بھی کسی تک خیالات کا وسیع دائرہ سمیٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور روزمرّہ کی طرح اپنے کام کاج میں مصروف نظر آنے لگا۔

کسے معلوم تھا کہ میاں بیوی کے درمیان ہونے والی رازدارانہ باتیں کسی اور نے بھی سُن لی ہیں۔ اور اتفاق سے سننے والا بھی وہی ہو جس کے متعلق باتیں ہو رہی ہوں۔ ساجدہ کو اپنے والد کے اداس ہو کر کچھ سوچنے کا شک تو اسی لمحہ ہوا تھا جب وہ ڈاکٹر کے کلینک سے واپس ہو رہے تھے اور تب سے وہ برابر اس کھوج میں رہی تھی کہ بابا ماں سے کیا کہیں گے۔ پھر جب اس نے ماں کو ان کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا تو چپکے سے آکر دروازے سے ٹیک لگائے بیٹھی وہ سب سُن لیا جو بند دروازے کے اندر کہا گیا تھا۔

بابا کے منہ سے اپنی مفلسی کا ذکر سُن کر وہ بہت رنجیدہ ہوئی تھی۔ پھر جب اچانک اپنا بر خود ڈھونڈنے کی بات سنی تھی تو اچھل پڑی تھی۔ اس کے آگے نہ وہ کچھ سُننا چاہتی تھی اور نہ ہی کچھ سُنا تھا۔ ظاہری طور پر اُسے اِس بات کی آزادی مل گئی تھی کہ وہ اپنے

لیے تو وہ کسی کا انتخاب کرے، کسی کو نظروں سے شکار کر کے جال میں پھانسے۔ اُسے کسی پہلو قرار نہ تھا۔ وہ بے قرار تھی، حد درجہ بے قرار۔ شادی کا نام سُن کر اُس کے چہرے کی مُردنی جاتی رہی تھی۔ اور اس پر ایک نئی بشاشت، ایک نیا رنگ، نئی دلکشی نے جگہ لے لی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کہیں دُور اُڑ کر چلی جائے۔ ایک ایسی جگہ جہاں ہر طرف ایک ہی نعرہ بلند ہو۔ بس شادی۔

مارے کسی غیبی خوشی کے وہ لمحہ بہ لمحہ اپنے بس سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ نیند آنکھوں سے چھُٹ گئی تھی۔ بار بار اس کے ہونٹوں پر بے وجہ مسکراہٹ بکھرتی جا رہی تھی۔ وہ کیف و مستی کے ایک ایسے دور سے گزر رہی تھی جہاں پہونچ کر ہر عورت کی ایسی ہی حالت ہوتی ہے۔

تین

گھر کی چار دیواری سے نکل کر اسے ایک ہی چیز کی تلاش تھی کہ کہیں کوئی سلجھا ہوا جوان ملے۔ ایک ایسا آدمی جو اُسے قبول کرے۔ اپنی ہمسائیگی میں ایسے نوجوان پیار کرنے والوں کی کمی نہ تھی، بشرطیکہ وہ کسی کو نظرِ التفات عنایت کرتی۔ کئی نوجوان اس کی ابھرتی ہوئی جوانی اور اس کا نکھرا ہوا حُسن دیکھ کر عش عش کرنے لگے۔ چند ہی روز میں ہر طرف اس کے چرچے ہونے لگے۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ کسی کے لبوں پر اس کا ذکر ہو، اس کے حُسن کی بات چلے، اس کی اداؤں پہ کوئی مر مٹے۔ ہوا بھی ایسا ہی۔ کل تک وہ گھر کی چار دیواری میں قید تھی۔ کوئی اسے جانتا تک نہ تھا۔ حسن اور خوب صورتی کی باتیں کون کرتا۔ آج وہ پردہ ہٹا کر باہر نکلی تو کنوارے نوجوانوں کا موضوعِ محبّت بن گئی۔ بیسیوں نے چاہا کہ وہ انہیں پیار کی ایک نگاہ سے دیکھے، کئی اس کے ساتھ ایک آدھ بات کرنے کو تڑپنے لگے۔ وہ تھی بھی بلا کی حسین، اتنی دلکش اور جوان کہ رہ رہ کے جنّت کی حور کا گماں ہوتا تھا۔ لمبے لمبے بالوں والی، گہری گہری آنکھوں والی، درمیانی قد و قامت، چمکیلے دانت، گلابی رخسار، سڈول جسم، لچک دار کمر۔ راہ چلتی تو اچک اچک کے اور دیکھنے والوں کی آنکھیں جھپک جاتیں، باتیں کرتی تو سُننے والوں کے کانوں میں شہد گھلنے لگتا۔ سراپا حُسن کا پیکر تھی وہ۔

گاؤں کے سبھی ابھرتے ہوئے نوجوانوں نے اُسے دیکھا۔ وہ سبھی کی آئیڈیل بن گئی۔

کئی اپنی راتوں کی نیند سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بہتوں کا چین و قرار لٹ گیا کئی ایسے بھی ہوئے جن کے خوابوں کا سرچشمہ وہی بن گئی۔ غرض ہر کوئی اس پر مر مٹنے لگا۔ اس بات سے کوئی منہ نہ موڑ سکا کہ ساجدہ کی جوانی رس بھری ہے۔ وہ اگر لاکھوں میں نہیں تو سیکڑوں میں ایک ضرور ہے۔ اس کشاکش میں کئی دن بیتے۔ اِس دوران اُس نے کئی مر مٹنے والے دیکھے، کئی پیار کے مدح خواں دیکھے، کئی للچائی نظروں کا سامنا کیا۔ لیکن نہ کوئی ان میں من کو بھایا اور نہ ہی کسی کے حق میں کوئی حتمی فیصلہ کر سکی۔

وہ چاہتی تھی کہ کوئی ایسا شکار پھنسنا چاہیئے جو ہر لحاظ سے اُس کے من کے موافق ہو شکل و صورت سے بھی، دھن دولت کے لحاظ سے بھی، تندرستی کے حساب سے بھی۔ چند روز پہلے اُس نے کچھ ایسا ہی باپ کو بھی کہتے سنا تھا۔ اور پھر بڑی بہن کی مثال اُس کے سامنے تھی جس نے ایسی ہی باتوں کو سامنے رکھ کر احمد کو پھانسا تھا اس پر ایسا جادو کیا تھا کہ وہ اپنی حیثیت بھول کر فقط اسی کا ہو کر رہ گیا تھا۔

یہی وجہ تھی جو وہ اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی تھی۔ کسی میں بھی یہ تمام خوبیاں موجود نہ تھیں۔ جن کی وہ متمنی تھی۔ اگر کوئی خوب صورت نظر آتا تو اس کے ساتھ مفلسی اور ناداری جڑی ہوتی، کوئی پیسے والا دکھائی دیتا تو وہ خوب صورت نہ ہوتا، یا اعضاء کے لحاظ سے کمزور معلوم ہوتا۔ اگر پھر بھی وہ کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم کر سکتی تو عمر بھر کی ٹھوکریں کھانا پڑتیں۔ لہٰذا اس نے صبر سے کام لیا اور مزید انتظار کرنے لگی۔ انتظار اگرچہ ناقابلِ برداشت تھا۔۔۔ وہ یوں بھی من کی آنکھوں سے ہر لمحہ، ہر پل ہر گھڑی ہر شئے کو ٹٹول کر دیکھ رہی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ بہت جلد اُس کی مراد پوری ہو گی۔ شاہ جی کے آستانے پر اس نے کئی بار چراغاں کیا تھا۔ تبھی وہ مطمئن تھی۔ اس نے اپنے تصور میں ایک ایسے پیار کرنے والے کو جگہ دی تھی جو ہر لحاظ سے اس کے قابل تھا، بس ایک نظرِ التفات عنایت کرنے کی دیر تھی۔

وہ پہل کرنے سے ڈرتی تھی۔ آخر عورت تھی نا۔ اور ہمارے معاشرے کی عورتوں کے متعلق تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ موت کو ترجیح دیں گی مگر صبر کا دامن نہ چھوڑیں گی۔ شرم وحیا کے پردے میں گھُٹ کر رہنا پسند کریں گی اور بے حیائی کو موت سے بدتر تصوّر، کریں گی۔

جن لوگوں نے ساجدہ کے حُسن کی غائبانہ تعریف سُنی تھی اور بن دیکھے ہی اُس پر فریفتہ ہوگئے تھے اُن میں ایک نام منظور کا بھی تھا۔ منظور ایک اچھے کھاتے پیتے گھر سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنی عمر کے سولہویں سال تک وہ دنیا کی ہر تخریب سے پرے تھا یا پھر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ابھی وہ زندگی کے اس دور میں داخل نہ ہوا تھا جس میں قدم رکھ کر کسی کو خاطر میں لایا جاتا ہے۔ کسی کے لیے دل تک آنے کی راہیں ہموار کی جاتی ہیں۔

وہ پیار و محبّت کی باتوں سے ناواقف تھا۔ تڑپنے اور تڑپانے کے عمل کو نہیں جانتا تھا۔ کسی کو اگر اتفاق سے اس دور سے گزرنا بھی دیکھ لیتا تو اس پر حقارت آمیز جملے کستا۔ وہ اس بات سے قطعی ناواقف تھا کہ وقت اُسے بھی اِس منزل پر لے آئے گا۔ اور اُس کی حالت بھی دیوانوں جیسی ہو جائے گی۔ وہ بھی دل میں کبھی کسی کا پیار بسا کر تڑپے اور ترسے گا۔ عورتوں سے باتیں کرتے ہوئے اُسے شرم آتی تھی۔ کبھی کسی لڑکی سے پالا پڑتا بھی تو وہ ایک آدھ بات کر کے ہی اپنا پیچھا چھڑاتا۔ اور ممکن ہے اس کی حد درجہ سنجیدگی کو پرکھ کر ہی اس پر نظر رکھنے والیوں نے اس کے قریب آنے کی کوشش نہ کی ہو۔

پھر جب وہ زندگی کے سترہ ویں سال میں داخل ہوگیا تو ہر چند اسے ایسا لگا کہ وہ اکیلا ہے۔ تنہا ہے۔ بے یار و مددگار ہے۔ وہ حسین تھا، جوان تھا، چوڑا چکلا سینا اور اس کے اندر ایک بڑا دل رکھتا تھا۔ لمبی سی قد و قامت کا مالک تھا۔ قسمت کا دھنی تھا۔ اُس کے ایک اشارے پر کئی لڑکیاں مرمٹتیں۔ لیکن فی الوقت اس نے اپنے دل کی دیرآید خواہش کو ظاہر کرنے سے پرہیز کیا۔ جلد بازی کر لیتا تو جانے کیا آفت آجاتی۔

اس کے ساتھی راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑتے تو وہ اُن کے خلاف ہو جاتا۔ اس کا قول تھا کہ محبت کرو کوئی بُرائی نہیں لیکن شرم و حیا کے پردے اٹھانے کے لیے کسی کو مجبور نہ کرو اور اگر ممکن ہو تو اپنی محبّت کو شادی کی منزل تک لے چلو، کیونکہ اس صورت میں ایک تو بدنامی کا ڈر نہ ہوگا اور دوسرے یہ کہ ثوابِ دارین حاصل ہوگا۔

کِسی کے خزاں رسیدہ گلشن میں اس نے اگرچہ فی الفور اپنی محبّت کا گُل نہ کِھلایا تھا، اس کے باوجود بھی وہ کسی کے بارے میں بات کرتا تو پھول مہکنے کا گمان ہوتا۔ یا اس چیز کی حقیقت سامنے آجاتی جس کے متعلق وہ سوچتا یا بات کرتا۔ ایک طرح سے یہ وہ ابتدائی دور تھا جس میں انسان قدم رکھ کر کسی چیز کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہے۔ اسے وقت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا ہے کہ وہ کس حد تک اچھی ہے اور کس حد تک بُری۔

اِسی دوران جب اُس کے دوستوں اور ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والوں نے ساجدہ کا ذکر کیا اور اس کے حُسن کے قصیدے پڑھنے شروع کئے تو ایک خواہش نے اس کے دل میں جنم لیا کہ وہ جلد از جلد اُسے دیکھے۔ دوسرے کے کہنے سے انسان کسی چیز کا اثر تو لے سکتا ہے لیکن اس وقت تک متاثر نہیں ہو سکتا جب تک وہ خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے ساجدہ اُس کے اپنے محلّے کی لڑکی تھی اس نے بچپن کے کئی اوراق اُلٹے تاکہ وہ اُس کا مطالعہ کر سکے اور مطالعہ کرنے کے بعد اُس نے یکسر جان لیا کہ ہو سکتا ہے دوست ٹھیک کہتے ہوں کیونکہ ایک تو وہ ان دِنوں سے ساجدہ سے واقف تھا جب وہ سنِ بلوغ کو بھی نہ پہونچی تھی اور نہ ہی اس کے اندر اپنی طرف مائل کرنے والی کوئی کشش تھی۔ ہر چند کہ وہ موہنی اور دل لبھانے والی شکل و صورت کی مالک تھی۔ اور دوسرے یہ کہ وہ خود اُن دنوں ایسی باتوں سے بے خبر تھا۔ لہٰذا اگرچہ وہ ساجدہ کے بارے میں کوئی مثبت رائے قائم نہ کر سکا پھر بھی وہ سُنتے ہی متاثر ہوا تھا۔

کئی بار اس نے ساجدہ کو نزدیک سے دیکھنے کی کوشش کی اور ہر بار یا تو وقت نے ساتھ نہ دیا، یا پھر ساجدہ ہی کو گھر سے نہ نکلتے دیکھ کر آہیں بھرنی پڑیں۔ اِس طرح اُس کے دل میں یہ بات نقش ہو کر رہ گئی کہ واقعی وہ بہت خوب صورت ہو گی جبھی تو بار بار دیکھنے کی تمنّا گھٹ کر رہ جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔ اس قول کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس کو کب تک انتظار کرنا پڑتا۔ چنانچہ ایک ہی برادری میں رہتے ہوئے عورتیں چوبیس گھنٹے تو پردے میں نہیں رہ سکتیں۔ یا پھر ہمارے معاشرے میں عورتوں نے پردے میں رہنا شروع کیا تو کام کاج ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔ لوگ بھوکوں مر جائیں گے۔ انسان کو انسان کھانے کو دوڑنے لگے گا۔ غرض ایک ایسا طوفان رونما ہو گا جس کو روکنے اور روک کر تلافی کرنے کی کسی میں ہمّت نہ ہو گی۔ ایک ساجدہ تو کیا، اس جیسی ہزاروں حسین لڑکیاں چاہیں بھی تو کسی کی نظروں سے نہ بچ سکیں گی۔

منظور کا انتظار اُس دن اختتام پذیر ہوا جس دن ساجدہ خلافِ توقع دوپہر کو اپنے کھیتوں کی دیکھ بھال کو نکلی۔ چنانچہ ایک مدّت تک بند کمرے میں رہ کر اس کی طبیعت اکتا گئی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اس کے دل میں جلتی ہوئی خاموش آگ ٹھنڈی پڑ جائے۔ چند روز سے اُس نے گھر کے کاموں میں زیادہ تر ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ کئی چھوڑے ہوئے کام پھر سنبھالے تھے۔ جن میں بابا کو کھیت پر کھانا لے جانے کا بھی ایک کام تھا۔

کھانا لے کر ہی وہ آج کھیت پر جا رہی تھی۔ اور اس کے اسی کام نے منظور کے دل کی خواہش پوری کر دی۔

دور ہی سے منظور نے اُسے آتے دیکھا، جو پگڈنڈی کے بائیں طرف رواں ندی کے کنارے سبز گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ کہنیاں زمین پر اس طرح ٹیک دی تھیں تاکہ جسم کا بوجھ اُن پر رہے اور سر اوپر ہو تاکہ اپنی طرف آنے والی کو غور سے دیکھ سکے۔ ساجدہ جوں

جوں جوں قدم آگے رکھتی جا رہی تھی، اُس کے حواس توں توں اُڑتے جا رہے تھے۔ دل کچھ اس انداز سے دھڑک رہا تھا کہ ہائے ے

ترے آنے کی خوشی میں مرا دم نکل نہ جائے

حُسن کی ساحرہ تبسم کی بجلیاں گراتی ہوئی اس کے سامنے سے گزر گئی اور وہ قدرت کے اس انمول تحفے کی دھڑکتے ہوئے دل سے سراہنا کرتا رہا۔ جس قدر شک تھا اس سے کچھ زیادہ دیکھنے میں آیا۔ جب توقع کے خلاف کوئی بات ظہور میں آتی ہے تو آدمی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اور پھر جب دل کا معاملہ ہو تو تڑپ کچھ اور ہی قیامت خیز ہوتی ہے۔ بہت دیر تک وہ ساجدہ کے خیالوں میں کھویا رہا۔ صحیح معنوں میں وہ اُسے اپنے تصور میں جگہ دے کر ان خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا تھا جو کئی روز سے اُسے مسلسل آرہے تھے۔ ساجدہ دل میں رکھنے والی چیز تھی۔ یہ اُسے بہر صورت ماننا ہی پڑا۔

دل کی دھڑکن جب کچھ مدھم ہوئی تو اُس نے اپنے دماغ پر زور دے کر سوچنا شروع کیا کہ بات آگے کیسے بڑھائی جائے؟ فی الفور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ لیکن وہ نا امید نہ ہوا بلکہ بڑی ہی مستعدی سے یہ فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو وہ ہر حال میں ساجدہ تک دل کی بات پہونچائے گا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اُس کی محبّت کا، جو اس کے سینے میں طوفان مچائے ہوئے تھا، مذاق نہ اُڑائے گی۔ ہر چند کہ اُسے یہ فعل ظاہر کرنے میں کچھ وقت ہی کیوں نہ درکار ہو۔

اسی دن سے وہ ساجدہ کے دل کی طرف آنے کی راہیں ہموار کرنے کی دھن میں لگا رہا اور ایسا کرنے سے اُسے ایک ابدی سکون مل رہا تھا۔

چار

اِس طرح منظور نے محبّت کی دنیا میں اپنا پہلا قدم رکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ اس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کا ایک ایک قطرہ راہِ الفت میں بہنے کے لیے بے تاب ہے اگر آج وہ اپنے ماضی کی طرف نظر پھیرتا تو اسے یقیناً حیرت ہوتی، بالخصوص یہ سوچ کر کہ وہ کبھی نہ تو کسی کو خاطر میں ہی لایا تھا اور نہ کسی کو کسی کے لیے تڑپتے دیکھ کر متاثر ہی ہوا تھا بصورتِ دیگر اگر انجانے میں کوئی پیار کرنے والا ملا بھی تھا تو اس پر قہقہوں کی بارش برسائی تھی۔

آج اس کی اپنی حالت عجب تھی۔ جب سے ساجدہ کو دیکھا تھا ہوش و حواس قائم نہ تھے، دل کچھ اداس سا تھا۔ نگاہیں حیران حیران سی نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھیں۔ بال اس طرح بکھرے ہوئے تھے کہ اگر کوئی ایسے میں اس کی طرف غور سے دیکھتا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ اس پر بھی قہقہوں کی بارش برستی۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی آخری تمنا ساجدہ ہی تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس کے خوابوں کی دنیا میں داخل ہو کر بسنے والی وہ پہلی لڑکی تھی۔ اور اس کا خیال ایک زندہ جاوید حقیقت کی طرح اس کے دماغ کے گوشے گوشے پر چھا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس رات ایک پل بھی نہ سو سکا۔ رات ناگن کی طرح اسے ڈس رہی تھی۔ کمرے کی چار دیواری اسے کھانے کو دوڑ رہی تھی۔ اور وہ دلِ بے کس کی طرح کبھی ان بدلے ہوئے حالات اور کبھی اپنی طرف دیکھ دیکھ کر اداس ہوتا رہا۔ مشکل سے وہ اس کی رات کی سحر دیکھنے

میں کامیاب ہو سکا اور ــــــ

"خس کم جہاں پاک" وہ تڑکے ہی اپنی منزل کی طرف دوڑتا نظر آیا جہاں پر کسی نے اس کا دل لوٹا تھا۔ ہر چند کہ ابھی سویرا تھا اور اگر ساجدہ آتی بھی تو دوپہر سے پہلے نہ آتی۔ یہ سوچ کر بھی اس کا دل نہ مانا اور کل کی طرح وہ آج بھی تصورِ جاناں کئے ہوئے محوِ انتظار ہو گیا۔

ابھی ساجدہ کے آنے کا کوئی محل نہ تھا پھر بھی کوئی معمولی سی آہٹ ہوتی تو وہ سر اُٹھاتا، نظریں پھیلا کر ادھر اُدھر دیکھتا اور کسی کو نہ پا کر، یا کسی اور کو پا کر ندی کے پانی کی اُس روانی کو دیکھ لیتا جس کے ساتھ سوز اور درد کی ایک ادا بھی شامل تھی۔

انتظار کرتے کرتے دوپہر ڈھل گئی اور تب کہیں ماہتاب نکل آیا۔ اُس کا دل کچھ اِس زور سے دھڑکا جیسے آخری بار دھڑکنے کے لیے مچل گیا ہو۔ اپنے دل کی یہ حالت دیکھ کر اُسے خود پر ترس آنے لگا۔ صبر کا دامن ہاتھ میں مضبوطی سے تھامے ہوئے اس نے دل کی اس بے قراری کو سمجھایا۔

"بیوقوف ــــ اسی ایک پیز کو دیکھنے کے لیے تو کل سے تڑپ رہا ہے، اب جب تیرا محبوب تیرے سامنے آ رہا ہے تو اتنی زور سے کاہے کو دھڑک رہا ہے۔ ذرا سنبھل کے رہ اور اچھی طرح سے دیکھنے دے ورنہ آج کا دن بھی بیکار جائے گا، اور پھر رات کے عذاب کو بھگتنا پڑے گا۔"

پھر واقعی اس کے دل کی دھڑکن اپنے اصلی مدار پر آ گئی۔ اور اسی لمحے ساجدہ اس کے سامنے سے گزرنے کو تھی، چنانچہ بڑی ہمّت کر کے اور موقعے کی نزاکت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے اندر کی آواز کو آزادی کا موقع دیا۔

"کب تک اٹھائے پھرو گی جوانی کا یہ بوجھ، جو اتنا بھاری ہے کہ تم سے اٹھائے نہیں اٹھتا، کچھ تو پاس کیا ہوتا اس جوانی کا بھی ـــ"

ساجدہ اچانک رک گئی۔ اس کے دل کی بات کسی اور کی زبان سے نکلی تھی۔ یہ لمحہ اس پر قیامتیں برپا کرتا ہوا گزر گیا۔ جوانی کا بوجھ صحیح معنوں میں اس سے اٹھائے نہیں اٹھتا تھا۔ اور وہ ایسے ہی بول کسی دوسرے کی زبان سے سُننا بھی چاہتی تھی۔ "یہ کون ہے کِس نے ایسا کہا؟ اسے کیسے معلوم ہے کہ میں اِسی عذاب میں مبتلا ہوں؟ ہاں میں جوانی کا یہ بڑھتا ہوا بوجھ نہیں سہہ سکتی۔" دھڑکتے ہوئے دل سے اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ منظور کی آنکھیں تابِ حُسن نہ لاکر جھک گئیں۔ اُسے ایسا لگا جیسے اچانک اس پر بجلی گِر گئی ہو۔ تبسّم کی بجلی۔ ساجدہ نیم وا آنکھوں سے اُسے مسلسل دیکھے جارہی تھی۔ یہ کوئی اور نہ تھا، منظور تھا اُسی کے محلے کا، اسی کی ہمسائیگی کا چشم و چراغ۔ کئی لمحوں تک وہ اُسے دیکھتی ہی رہی اور سوچتی ہی چلی گئی ـــــــ ہر لحاظ سے اچھا تھا، بالکل وہی جس کا اس نے تصوّر کیا تھا جس کے تصوراتی پیکر سے اُس نے اپنے خواب سجائے تھے۔ بلکہ اُس سے بھی بڑھ چڑھ کر۔ "منظور ـــــ تم سبھی کے منظورِ نظر ہو، ہائے میں قربان جاؤں، ایک تم ہو جو مجھے جیت سکتے ہو، تم ہی مجھے عمر بھر خوش بھی رکھ سکتے ہو، تم شکل و صورت سے بھی بہت اچھے ہو، تندرست بھی ہو اور دھنی بھی۔ میرے دماغ میں تمہارا خیال پہلے سے ہی کیوں نہ تھا؟ مگر...... مگر ہوتا بھی کیسے۔ اللہ، تم ملے تو میری دیرینہ خواہش پوری ہوئی میں بنا جھجک کے یہ کہہ سکتی ہوں کہ مجھے تمہاری ہی تلاش تھی۔ تمہاری، صرف تمہاری میرے خوابوں کے مالک! میری محبت کے سرتاج، آؤ اب ملے ہو، پیار کی دنیا میں کھو جائیں اور دنیا والوں کے کبھی ہاتھ نہ آئیں۔"

اِن لمحات میں اُس نے نہ جانے کیا کچھ سوچ لیا۔ وہ کہاں تھی اور کہاں پہونچ گئی ہوش میں آئی تو منظور کو اپنی طرف ٹکٹکی باندھ کے دیکھتا ہوا پایا۔ لاج آئی اور بناوٹی غصہ سے ٹوک دیا۔

"بے شرم ـــــ راہ چلتی لڑکیوں سے پیش آنے کا یہ بھی کوئی طریقہ ہے، کسی اور نے

تمہاری بات سن لی ہوتی تو کیا کہتا، کیا سوچتا؟ —"

"یہ ہی کیا کم ہے کہ تم نے سُنی —" منظور ہمّت کر کے بولا۔ "اور میں نہیں چاہتا ہوں کہ اِسے تمہارے علاوہ بھی کوئی سُنے۔ کاش تم اِسے سمجھنے کی بھی کوشش کرتیں۔"

ساجدہ کو ایسا لگا جیسے برقی رَو نے اُسے چھولیا ہو۔ کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ وہ پہلے ہی یہ سوچ کر رہ گئی تھی کہ ہو نہ ہو منظور ہی اس کی دلی خواہش کا مُداوا ہے۔ اور ظاہر ہے اس نے اس بات او پری دل سے تقدیم بھی کی تھی لیکن پھر بھی اتنی جلد زبان تو نہ دے سکتی تھی۔ لہٰذا مسکرا کر صرف زبان سے اتنا نکل سکا کہ "جاؤ میں کیوں سمجھنے لگی تمہاری باتیں۔" اور دل میں یہ سوچ کر رہ گئی کہ کاش میرا خدشہ صحیح ثابت ہو۔ اور تم میرے دل کے مالک بن کر رہ جاؤ۔

منظور نے جب دیر تک اسے کھویا کھویا سا پایا تو اسے یہ سمجھنے میں چنداں دیر نہ لگی کہ تیر ٹھکانے پر لگا ہے۔ کچھ تحمّل سے اس نے پوچھا۔

"یہ آج تم نے دیر کیوں کر دی تمہارے بابا تو بھوک سے نڈھال ہو رہے ہوں گے۔"
اس نے بات کہنے کو کہی مگر کہنا یہ چاہتا تھا کہ مجھے آج بہت انتظار کرنا پڑا۔ رات بھر جاگتا رہا ہوں اور تم اتنی دیر سے آئیں کہ کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا۔

"میں دیر سے آئی —— لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا، ہو سکتا ہے میں روز اسی وقت آتی ہوں گی۔"

"نہیں غلط کہا تم نے —— کل تم ٹھیک گیارہ بجے یہاں سے گزری تھیں۔ اور آج تو ڈیڑھ بھی آتے آتے بجا دیا۔"

"تو اس کا مطلب ہے تم کل بھی مجھے چھیڑنے کی نیت سے آئے تھے۔"
منظور کو یہ سُن کر ہنسی آگئی۔ جیسے وہ جلدی کر گویا ہوا —— "چھیڑنے کی غرض سے نہیں آیا تھا اور نہ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔ ہاں البتہ انتظار ضرور کر رہا تھا۔"

"انتظار ــــ؟" ساجدہ جانتے ہوئے بھی انجان بنتی رہی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ منظورؔ کل بھی اُسے یہاں نظر آیا تھا۔ لیکن کسی اور خیال میں گم ہونے کی وجہ سے وہ اُس کی سب حرکات نہ دیکھ سکی تھی۔ دیکھتی تو اسی وقت اندازہ کرلیتی کہ اُس کا بھی کوئی انتظار کرنے والا ہے۔ جس کا اسے صحیح معنوں میں آج شک ہوا۔ بولی

"کِس کا انتظار کر رہے تھے تم؟"

"تمہارا ــــ"

"میرا ــــ" آواز تحیّر زدہ تھی۔

"ہاں تمہارا اور کس کا ــــ"، منظورؔ نے نظریں نیچی کرلیں "تم ہی تو ہو جس نے محلے میں ایک عجیب سی ہلچل مچارکھی ہے۔ جو بھی ملتا ہے بس تمہارا ہی افسانہ سُناتا نظر آتا ہے۔ تمہارے ہی حُسن کے گیت گاتا سنائی دے رہا ہے۔"

"اُن سب کو کیا ہوگیا ہے، کیا اُن کی کوئی اپنی ماں بہن نہیں ہے، جو میں موضوعِ بحث بن گئی ہوں۔"

کم از کم اتنا کہنا تو ضروری تھا۔ اس لیے تاکہ منظورؔ یہ نہ سمجھے کہ اس کام میں اس کی اپنی خواہش ہے۔ یعنی وہ چاہتی ہے کہ ہر ایک کی زبان پر اُس کا نام آئے۔

منظورؔ نے اُسے اُداس ہوتے دیکھ کر بڑے ہی پُر تکلّف انداز میں کہا۔

"بس اتنی سی بات پر تمہیں بُرا لگا۔ ارے مَیں تو کہتا ہوں کہ کاش میرا افسانہ بھی کسی کی زبان تک آئے۔ جگہ جگہ میری باتیں ہوں، لوگ میرے حُسن کی تعریف..... ہونہہ..... مگر.....!" وہ کچھ سوچ کر خاموش ہوگیا اور دل سے آواز آئی "مگر میں تھوڑی عورت ہوں جو کوئی میرے حُسن کی بات کرے۔" ہنسی اس کے حلق سے چھوٹنے کو تھی کہ ساجدہ بول پڑی۔

"تمہاری بات تو دوسری ہے مگر مَیں تو عورت ہوں اور عورت کا فسانہ کسی

کی زبان تک آنا تو باعثِ رسوائی ہوتا ہے۔

"اچھا۔ اگر یہ بات ہے تو میں کسی کو تمہارے بارے میں کچھ نہ کہنے دوں گا۔ کسی نے آج کے بعد کچھ کہا تو میں اُس کی زبان کھینچ لوں گا۔ دیکھ لینا۔"

"تمہیں مجھ سے ایسی کیا ہمدردی ہے۔؟" اُس نے شوخ تبسم سے سوال کیا۔

"کہوں کون سی ہمدردی ہے؟" منظور نے ڈرتے ڈرتے اُلٹا سوال کر دیا۔

"ہاں کہو۔۔۔!"

"میں تم سے پیار کا خواہش مند ہوں، ساجدہ مجھے یقین ہے کہ تم میری پیش کش کو ٹھکرا نہ دو گی۔" وہ بمشکل تمام کہہ سکا۔ "جب سے تمہاری اور تمہارے حُسن کی باتیں لوگوں سے سُنی ہیں دل بس سے باہر ہوتا گیا۔ حالانکہ ایک مدّت تک میں اس سچ کو تسلیم کرنے سے قاصر رہا، کیونکہ تب تک میں نے تمہیں عشق کی آنکھ سے نہ دیکھا تھا۔ اور نہ ہی مجھے کبھی ایسا موقع فراہم ہوا تھا۔ اب جبکہ تم میرے سامنے ہو، اور میں تمہارے سامنے، میں دیکھ رہا ہوں کہ جتنا سُننے میں آیا تھا تم اس سے بھی کہیں زیادہ دلکش اور حسین ہو۔ تمہارا یہ حُسن مجھ پر بجلیاں گرا رہا ہے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنی رائے ظاہر کر کے مجھے اِن بجلیوں کے عتاب سے بچا سکو؟"

ساجدہ دل کے گوشوں سے منظور کی باتیں سُن رہی تھی۔ اُس کی صاف گوئی پر اُسے اور زیادہ پیار آ رہا تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے دل کا مدّعا صاف لفظوں میں بیان کیا۔ اِس دوران میں ساجدہ نے اپنے کچھ اور فدائیوں کا بھی ذہن میں خیال کیا، جو صرف اُس کے حسن کی رعنائیوں کے شیدائی تھے۔ حقیقی معنوں میں وہ اُس کے ساتھ کوئی پیار نہ کرتے تھے بلکہ بھوکی نظروں سے صرف اُسے تک رہے تھے۔ صرف اتنا چاہتے تھے کہ اس کے ساتھ چند دن تک رنگ رلیاں منائیں اور پھر ہمیشہ کے لیے الوداع کہیں۔ اُسے اُن

بھو کے ہیولوں پر بہت غصہ آیا۔ اور ان کے خیال کو دل سے اسی لمحہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال پھینکا۔ اور دوبارہ کنکھیوں سے منظور کی طرف دیکھا۔ جو ابھی تک اور نہ جانے کیا کچھ کہہ چکا تھا۔ لیکن وہ خیالات کے سمندر میں ڈوب جانے کی وجہ سے اس کے سوا کچھ زیادہ نہ سمجھی تھی کہ منظور مجھے جیت چکا ہے۔ میں لاکھ نہ کہوں لیکن میرا دل اس کا ہو کر رہ گیا ہے۔ اور جب آب و آتش میں قربت ہو ہی گئی تو بھاپ اٹھنے میں اتنی دیر کیوں؟

وقت کی نزاکت کا پاس کرتے ہوئے اس نے لفظوں کا تیر پھینکا۔

"تم بڑے وہ ہو۔۔۔ دل لگانا کوئی تم سے سیکھے۔"

"دل تو کیا، تمہارے ایک اشارے پر میں خون بھی بہا سکتا ہوں۔" وہ بڑے عزم کے ساتھ بولا۔ اور ساجدہ کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔ وہ دل کے ان ٹکڑوں کو بکھرنے سے روک بھی نہ سکی۔ فرطِ مسرت سے ہمکنار ہو کر بہت کچھ کہنا چاہا لیکن بابا کو کھانا دیر سے لے جانے کے ڈر سے صرف اتنا کہہ سکی۔

"تمہارے ارادوں سے مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس خوف سے میرا دم نکل جائے۔"

"خدا نہ کرے، تمہارے دم سے ہی تو میرا دم ہے۔ تمہیں کچھ ہوا تو میں خود کو سنبھال نہیں پاؤں گا۔ چاہے دنیا کی تمام خوشیاں میرے نام لکھ دی جائیں۔"

"اچھا ــــ" ساجدہ کے دل سے آہ پھوٹ پڑی۔

"ہاں ــــ! کہدو تو یہ زندگی آج ہی تمہارے نام لکھ دوں۔ کیا معلوم کل کیسا ہو۔"

"نہیں، اتنی جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ کل جیسا بھی ہو ہمیں بہر حال اُس کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"مگر بزرگوں کا تو قول ہے کہ نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیئے۔"

"چل ہٹ بے شرم کہیں کا۔" ساجدہ نے بناوٹی غصہ سے ٹوک دیا اور اپنی راہ ہولی۔

منظور اُس کے جاتے قدموں کو آنکھوں سے اوجھل ہونے تک دیکھتا رہا۔ اور دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا۔

پانچ

ادھر منظور کی حالت مجنوں جیسی تھی۔ بات کرتا تو بہک بہک جاتا۔ اور سننے والا ایک زاویہ نگاہ سے اُس کی طرف دیکھتا رہ جاتا۔ اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتا کہ آخر اُسے کیا ہو گیا ہے۔ کل تک تو وہ اپنی صحیح الدماغی کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں اپنا ایک الگ مقام رکھتا تھا۔ اور اُس کے ساتھی اُس سے مشورہ کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے کسی کا بھی کوئی مسئلہ ہوتا تو اُسی کے پاس دوڑتا، اور وہ فوراً اس کا حل بتا دیتا۔ مشکل پیش آنے والے کو مشکل سے چھٹکارا پانے کے واسطے اس کی غیر معمولی بات سُن کر اپنے آپ پر غصّہ آجاتا کہ یہ خیال اس کے ذہن میں کیوں نہ آیا تھا۔ آج وہی منظور اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔ اُس کے پاس حسب معمول کئی آدمی آئے جنھوں نے اپنے مسائل اُس کے سامنے رکھے لیکن وہ کسی کو تسلّی بخش جواب نہ دے سکا۔ کسی کی مشکل حل کرنے کی تجویز نہ بتا سکا۔

اُس کی آنکھوں سے اب ذہانت کی چمک غائب ہو گئی تھی اور دیوانگی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ کسی کی طرف دیکھتا تو دیکھتا ہی رہتا اور سامنے والا خود ہی اُن نگاہوں کی تاب نہ لا کر سر جھکا لیتا۔

اُس کے قدم بھی کہیں کے کہیں پڑ رہے تھے۔ دیکھنے سے لگتا تھا جیسے کوئی شرابی میخانے سے چلا آرہا ہو۔ گرتا اور سنبھلتا جا رہا تھا۔ اس کی یہ حالت ساجدہ کی

نظرِ عنایت کی دین تھی۔ اُسے اگر کچھ یاد بھی تھا تو فقط ساجدہ کا نام، اور اس کے سوا وہ کچھ ذہن میں رکھنا بھی نہ چاہتا تھا۔ بس ساجدہ کی باتیں یاد رکھنے کو کافی تھیں۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ تم کل بھی مجھے چھیڑنے کی نیت سے آئے تھے۔"

"چھیڑنے کی نیت سے نہیں آیا تھا اور نہ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے، ہاں البتہ انتظار ضرور کر رہا تھا۔"

"انتظار —! کس کا انتظار کر رہے تھے تم؟"

"تمہارا —!!"

"میرا —؟"

"ہاں، صرف تمہارا۔ تم ہی تو ہو جس نے محلے بھر میں ایک عجیب سی ہلچل مچا رکھی ہے، جو بھی ملتا ہے بس تمہاری ہی جوانی کے گیت گاتا نظر آتا ہے۔"

اور یہ سچ بھی تھا۔ آج اگر منظور ساجدہ کی یاد میں غرق اپنے اردگرد سے بے خبر تھا لیکن جب تک وہ اپنی اصلی ہیئت میں تھا تو عشق کے تازہ واردوں کے لبوں پر اُسی کی بات تھی۔ اور اتنے سارے شیدائیوں اور فدائیوں میں اُس نے چوری چھپے منظور ہی کو اپنا محبوب تسلیم کیا تھا جو اگرچہ اس میدان میں دیر ہی سے اترا تھا، اُسے پھر بھی یقین تھا کہ وہ بازی جیت لے گا۔ اور کسی حد تک اُس نے میدان مار لیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید ساجدہ اس کے پیار جتانے پر سخت ناراض ہوتی یا یہ سُننا پسند ہی نہ کرتی کہ

"میں تم سے پیار کا خواہش مند ہوں ساجدہ! مجھے یقین ہے کہ تم میری پیش کش کو ٹھکرا نہ دو گی۔"

اور بدلے میں ایسا ریمارک استعمال نہ کرتی کہ

"جاؤ تم بڑے وہ ہو۔ پیار جتانا کوئی تم سے سیکھے۔" بلکہ اُس پر یہ سب باتیں ناگوار گزرتیں۔ اس کے باوجود اُس نے منظور کو اپنے دل کی بات کہنے کا پورا پورا موقعہ

دیا تھا۔ اور اُس کی باتیں بڑے ہی غور سے سُنتی رہی تھی۔ اِس لیے منظور ؔ کا اُس کے پیار میں سرشار ہونا فطری تھا۔

اُدھر ساجدہ کی حالت بھی کسی لیلہ سے کم نہ تھی۔ جب سے اُس کا سامنا منظور سے ہوا تھا تب سے اُس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ رہ رہ کے اُسی کے خیال آرہے تھے۔ پچھلے کئی ماہ سے وہ اس کشمکش میں مبتلا تھی کہ کوئی اُس کے حُسن پر فِدا ہو، اس کے ساتھ پیار جتانے کی کوشش کرے، عمر بھر اُس پر مر مٹنے کا وعدہ کرے۔ کئی نوجوانوں کی نظریں اس پر مرکوز تھیں جو اُس کے حُسن کے دلدادہ تھے۔ اس کی تعریف میں قصیدے پڑھتے نظر آتے تھے۔ اسے اپنانے کے آرزومند تھے لیکن کسی نے اُسے متاثر نہ کیا تھا۔ کوئی پیار کی کسوٹی پر پورا نہ اترا تھا کسی پر اس کا دل پسیج نہ گیا تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ کوئی ایسا بھی نہ تھا جو اپنے دل میں اٹھنے والے اس جذبے کو زبان دے کر اس کے سامنے اظہار کر سکتا۔ اگر کسی نے یہ ہمّت کی ہوتی تو ممکن تھا کہ وہ اس کے بارے میں سوچ لیتی۔ اس صورت میں پسند اور ناپسندیدگی کا سوال دوسرا ہوتا۔

چنانچہ منظور وہ پہلا آدمی تھا جس نے اپنے دل کی بات اپنی پہلی فرصت میں ظاہر کی تھی اور وہ ہر لحاظ سے، ہر اعتبار سے اچھا تھا لہٰذا ساجدہ کے پاس انکار کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ جو وہ اسے جھٹک دیتی۔ منظور ؔ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اُس کا پیار جتانا تو اس کی بگڑی ہوئی قسمت سنوارنے کے مترادف تھا۔ یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا یا ایسا کوئی ارادہ رکھتا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اُس نے 'ہاں' کرنے میں اتنی دیر کیوں کر دی۔ بھلا اُسے اگر اپنی طرف سے ہی پہل کرنا پڑتی تو کوئی عیب نہ تھا۔ جو چیز من کو بھائے اُسے حاصل کرنے کے لیے اگر ایسی قربانی دینی بھی پڑتی تو اسے گریز نہ کرنا چاہیئے تھا لیکن چونکہ یہ نوبت آئی ہی نہ تھی اور منظور ؔ خود ہی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھوٹ پڑا تھا۔ اور وہ تمام راہیں ہموار

ہو گئی تھیں جن کو دیکھ کر اسے اپنی منزل تک پہونچنے کا سُراغ ملا تھا۔ پھر بھی وہ یہ سن کر کہ "نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیئے"، کے جواب میں یہ کہہ گئی تھی کہ

"چل ہٹ بے شرم کہیں کے۔"

یہ کہنے کے بعد اُسے افسوس ضرور ہوا تھا کہ وہ بات کو طول کیوں دے گئی اگرچہ اِس صورت میں اُسے اپنی صحیح قیمت کا پتہ چلتا۔

تب سے اُس کی نیند لُٹ گئی تھی۔ اس کے دل کا قرار چھن گیا تھا۔ رات میں یا تو اُس کی آنکھیں منظور کے خواب سجاتیں یا پھر آسمان کے تارے گنتیں۔

یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا۔ ایک رات اپنی بہن کی اِس تبدیلی کو دیکھ کر شمی نے بڑے ہی معصومانہ انداز میں اس سے پوچھا۔

"دیدی ــــ! کئی دنوں سے میں تمہیں اُسی مقام پر آئی دیکھ رہی ہوں جہاں تم پہلے ہوا کرتی تھیں۔ لیکن اب ایک تغیّر سا بھی آگیا ہے۔ پہلے تم پریشان ہوا کرتی تھیں اور وہی پریشانی تمہیں سونے نہیں دیتی تھی مگر اب بظاہر تم کسی گہری سوچ میں رہا کرتی ہو، جو کبھی کبھی تمہیں خود ہی ہنساتی ہے اور کبھی خود ہی سے مایوس کر دیتی ہے۔ آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟"

"مجھے کیا ہونے لگا ــــ" وہ انجان بن کر بولی۔

"اگر کچھ ہوا نہیں ہے تو یہ رات رات بھر جاگتے رہنا کہاں کی عقلمندی ہے۔؟"

"جب نیند ہی نہ آئے تو کوئی کیا کرے؟"

"تم جو سونے کی کوشش ہی نہ کرتی ہو تو نیند کیسے آئے گی۔"

"میں چاہوں تب بھی نیند نہ آئے گی، پھر آنکھیں بند ہی کیوں کروں۔"

"مگر کیوں؟ کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی تمہاری نیندیں تم سے چھن گئی ہیں؟ کون سا روگ لگا ہے تمہیں، کون سا غم لگا ہے تمہیں جس نے تمہارا چین تمہارا قرار

تم سے چھین لیا ہے۔ آخر تم کسی سے کچھ بولتی کیوں نہیں ؟"

"شمی ——!" ساجدہ نیم وا آنکھوں سے کھڑکی سے باہر د
میں واقعی دنیا سے بے نیاز ہو گئی تھی اور اسی لیے نیندیں لٹ گئی تھیں۔ لیکن بظاہر میں زندگی سے مطمئن ہوں اور آسمان کے یہ چمکتے ہوئے تارے مجھے بتا رہے ہیں سرے سے اپنی آنکھ بند نہ کرنا بس دیکھتے رہنا اور دیکھتے رہنا۔ اسی دیکھا دیکھی میں اب میرے دل میں ایک چور گھس آیا ہے۔ جو......"

"چور گھس آیا ہے ——" شمی نے اُس کی بات کاٹ کر تعجب خیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے سُنا ہے کہ چور نقب لگانے کے لیے گھروں میں گھستے ہیں یہ دل میں گھسنا انہوں نے کہاں سے سیکھ لیا ؟"

ساجدہ کو ہنسی آگئی، واقعی شمی کے لیے اس بات کو سمجھنا آسان نہ تھا۔ اپنی بہن کو بے وجہ ہنستے دیکھ کر وہ خفا ہو کر بولی۔

"ہنستی کیوں ہو پاگل کی طرح ——"

"تمہاری معصومیت پر ——"

"میری معصومیت پر ہنستی ہو اور اپنا پاگل پن نظر نہیں آتا ہے۔ اگر کسی نے تمہاری یہ بات سُنی کہ دل میں چور گھس آیا ہے تو واقعی تمہیں پاگل قرار ٹھہرائے گا۔"

اور اس سے پہلے کہ ساجدہ جواب میں کچھ کہتی ان کی ماں نے دروازہ کھول دیا۔ دونوں کو جاگتے دیکھ کر اُس نے کہا۔ "بہ تم ابھی تک سوئی نہیں ہو —— آدھی سے زیادہ رات بیت چکی ہے ——"

دونوں بہنیں کھسیا کر رہ گئیں۔ اور ماں کے یہ کہنے پر کہ سو جاؤ اب، صبح سویرے اٹھنا، دونوں نے بستر درست کیا اور رضائی اوڑھ کر خاموشی اختیار کر لی۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔

ہو گئی تھیں جن کو دیکھ کر اسے اپنی منزل تک پہونچنے کا سُراغ ملا تھا۔ پھر بھی وہ یہ سن کر کہ "نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیئے،" کے جواب میں یہ کہہ گئی تھی کہ

"چل ہٹ بے شرم کہیں کے۔"

یہ کہنے کے بعد اُسے افسوس ضرور ہوا تھا کہ وہ بات کو طول کیوں دے گئی اگرچہ اِس صورت میں اُسے اپنی صحیح قیمت کا پتہ چلتا۔

تب سے اُس کی نیند لُٹ گئی تھی۔ اس کے دل کا قرار چھن گیا تھا۔ رات میں یا تو اُس کی آنکھیں منظور کے خواب سجاتیں یا پھر آسمان کے تارے گنتیں۔

یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا۔ ایک رات اپنی بہن کی اِس تبدیلی کو دیکھ کر شمی نے بڑے ہی معصومانہ انداز میں اس سے پوچھا۔

"دیدی ـــــ! کئی دنوں سے میں تمہیں اُسی مقام پر آئی دیکھ رہی ہوں جہاں تم پہلے ہوا کرتی تھیں۔ لیکن اب ایک تغیّر سا بھی آگیا ہے۔ پہلے تم پریشان ہوا کرتی تھیں اور وہی پریشانی تمہیں سونے نہیں دیتی تھی مگر اب بظاہر تم کسی گہری سوچ میں رہا کرتی ہو، جو کبھی کبھی تمہیں خود ہی ہنساتی ہے اور کبھی خود ہی سے مایوس کر دیتی ہے۔ آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟"

"مجھے کیا ہونے لگا ـــــ" وہ انجان بن کر بولی۔

"اگر کچھ ہوا نہیں ہے تو یہ رات رات بھر جاگتے رہنا کہاں کی عقل مندی ہے ـــ؟"

"جب نیند ہی نہ آئے تو کوئی کیا کرے؟ ـــ"

"تم جو سونے کی کوشش ہی نہ کرتی ہو تو نیند کیسے آئے گی ـــ"

"میں چاہوں تب بھی نیند نہ آئے گی، پھر آنکھیں بند ہی کیوں کروں ـــ"

"مگر کیوں؟ کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی تمہاری نیندیں تم سے چھن گئی ہیں؟ کون سا روگ لگا ہے تمہیں، کون سا غم لگا ہے تمہیں جس نے تمہارا چین تمہارا قرار

تم سے چھین لیا ہے۔ آخر تم کسی سے کچھ بولتی کیوں نہیں ؟"

"شمی ــــ!" ساجدہ نیم وا آنکھوں سے کھڑکی سے باہر دیکھتی ہوئی بولی "پہلے میں واقعی دنیا سے بے نیاز ہو گئی تھی اور اسی لیے نیندیں لُٹ گئی تھیں۔ لیکن کئی دنوں سے بظاہر میں زندگی سے مطمئن ہوں اور آسمان کے یہ چمکتے ہوئے تارے مجھے بتا رہے ہیں کہ اپنی آنکھ بند نہ کرنا بس دیکھتے رہنا اور دیکھتے رہنا۔ اسی دیکھا دیکھی میں اب میرے دل میں ایک چور گھس آیا ہے۔ جو......"

"چور گھس آیا ہے ــــ" شمی نے اُس کی بات کاٹ کر تعجب خیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نے سُنا ہے کہ چور نقب لگانے کے لیے گھروں میں گھستے ہیں یہ دل میں گھسنا انہوں نے کہاں سے سیکھ لیا ؟"

ساجدہ کو ہنسی آگئی، واقعی شمی کے لیے اس بات کو سمجھنا آسان نہ تھا۔ اپنی بہن کو بے وجہ ہنستے دیکھ کر وہ خفا ہو کر بولی۔

"ہنستی کیوں ہو پاگل کی طرح ــــ"

"تمہاری معصومیت پر ــــ"

"میری معصومیت پہ ہنستی ہو اور اپنا پاگل پن نظر نہیں آتا ہے۔ اگر کسی نے تمہاری یہ بات سُنی کہ دل میں چور گھس آیا ہے تو واقعی تمہیں پاگل قرار ٹھہرائے گا۔"

اور اس سے پہلے کہ ساجدہ جواب میں کچھ کہتی ان کی ماں نے دروازہ کھول دیا۔ دونوں کو جاگتے دیکھ کر اُس نے کہا۔ "تم ابھی تک سوئی نہیں ہو ــــ آدھی سے زیادہ رات بیت چکی ہے ــــ"

دونوں بہنیں کھسیا کر رہ گئیں۔ اور ماں کے یہ کہنے پر کہ سو جاؤ اب، صبح سویرے اٹھنا، دونوں نے بستر درست کیا اور رضائی اوڑھ کر خاموشی اختیار کر لی۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔

چھ

آخر جب پیار نے دونوں کو تڑپا ہی دیا تو چھپ چھپ کر ملنے اور پیار کرنے کی راہیں نکل ہی گئیں۔

محبت نے خاموشی کو زبان بخش دی اور نگاہوں کو نگاہوں سے باتیں کرنے کے انداز آ ہی گئے۔ اندر ہی اندر جلنے والی آگ کی تپش نے ساجدہ کو یہ کہنے کے لیے مجبور کر ہی دیا ــــ

"منظور ــــ! آخر تم نے مجھے اپنے پیار سے بے بس کر ہی دیا۔ بے خودی کا یہ عالم ہے کہ میں رہ رہ کھوئی جا رہی ہوں، گم ہوتی جا رہی ہوں۔"

"مجھے اپنے نصیب پر فخر ہے ساجدہ! جیسے تمہارا پیار مل گیا، اندھے کو دو آنکھیں مل گئیں سمجھو ــــ"

"میں بھی اپنی قسمت پر جتنا ناز کروں کم ہے۔ اس دنیا میں میں نے بہت سے پیار کرنے والوں کو دیکھا لیکن تمہاری محبّت میرے دل میں گھر کر گئی۔ تمہاری محبّت کو میں دنیا کی عظیم ترین دولت تصور کرتی ہوں۔ اور خدا سے دعا کرتی ہوں کہ ہمارا یہ ربط صدیوں تک بنا رہے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو ــــ"، منظور کے دل سے آواز نکلی۔ وہ دور آسمان کے اُس حصّے کو دیکھنے لگا جس پر بادل کے دو ٹکڑے ایک دوسرے میں مدغم ہونے

کے لیے بیقرار ہو رہے تھے۔ ساجدہ نے اُسے کھویا ہوا پا کر پوچھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"دور کے اُن بادلوں کو دیکھ رہا ہوں جو نزدیک ہو کر بھی ایک دوسرے سے ملنے کو بیقرار نظر آتے ہیں۔ تم بھی دیکھ لو نا، اُدھر وہ دیکھو۔" اُس نے ہاتھ کے اشارے سے دکھایا اور ساجدہ بھی اسی طرف دیکھنے لگی۔ وہ غالباً آسمان کے اُس طرف دیکھ رہی تھی لیکن اُس کا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اُس نے نظریں سمیٹ لیں اور ایک ادائے دلربا کے ساتھ بولی۔

"بادل کے یہ آوارہ ٹکڑے ہمیں اپنے پیار کی مثال پیش کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہونا۔ عمر بھر ایک دوسرے کے لیے بنے رہنا، کیا تم بھی یہی سوچ رہے ہو ــــ؟"

"ہاں واقعی، تم نے میرے دل سے چھین کر بات کہی۔ ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو کر بھی مجھے لگتا ہے کہ ہم دُور دُور ہیں۔"

"دوریوں کو اب مٹانا ہوگا، پیار و محبت میں دوریوں کا کیا کام ــــ"

"تو پھر میرے قریب آنے سے ہچکچاتی کیوں ہو؟ کیا تم کچھ اور بھرم رکھنا چاہتی ہو۔"

"نہیں ــــ کچھ دور اس لیے رہنا اچھا لگتا ہے تاکہ تمہیں غور سے دیکھنے کا موقع مل سکے۔"

"اگر تم مجھے خوب صورتی کی آنکھ سے دیکھنا چاہتی ہو تو شاید تمہیں مایوسی ہوگی۔"

"مایوسی کیوں ....؟" اُس نے معصومیت سے سوال کیا۔

"میں خوب صورت تھوڑی ہوں۔" اُس نے بھی معصومیت سے جواب دیا۔ لیکن اپنی جو تصویر وہ پیش کر رہا تھا وہ ساجدہ کے دل کو لمحہ لمحہ تڑپا رہی تھی۔

"اوروں کے لیے نہ سہی مگر میرے لیے تم کسی فرشتے سے کم نہیں، تمہاری یہی صورت

تو مجھے مارے جا رہی ہے۔ بے بس کرتی جا رہی ہے۔ میں تو اس بانختہ ہوتی جا رہی ہوں۔"

"یہ تمہاری محبّت ہے، ورنہ میں تو اس لائق نہیں ہوں۔ ناکامی اور مایوسی کی ایک تصویر ہوں، ایک بے رنگ اور بھدّی تصویر۔"

"مجھے اس تصویر میں رنگ بھرنا آتا ہے۔ تم جیسا چاہو، ویسا رنگ بھر دوں گی۔"

"ہاں تم ہی اس تصویر میں رنگ بھر سکتی ہو اور کوئی نہیں۔ ایک ایسا رنگ جو سارے رنگوں سے زیادہ خوب صورت ہے زیادہ مقدس ہے ــــ اور وہ رنگ ہے پیار کا رنگ۔"

"اچھا یہ بتاؤ ــــ" ساجدہ نے موضوع بدل کر بات شروع کی۔ "مجھے کتنا چاہتے ہو ــــ؟"

"بہت ــــ" منظور عالم خیال میں بولا۔

"اگر کوئی تم سے مجھے چھین لے گیا تو ــــ؟" سوال کرتے کرتے ساجدہ کی آنکھ بھر آئی۔ اور منظور پر بھی کچھ کم اثر نہ ہوا۔ وہ ایسے چونکا جیسے اُس کے ذہن پر ہتھوڑا پڑا ہو۔

"کیا کہا ــــ ؟؟؟" وہ اونچی آواز میں بولا۔ حالانکہ اُس کا دل ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

"ارے کس میں اتنا دم ہے جو تمہیں مجھ سے چھین سکے۔ اس ماں کے لعل نے اس دھرتی پر جنم نہیں لیا۔ اور نہ کبھی لے سکے گا۔ اُسے اپنی جان پیاری نہیں ہے کیا؟"

دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ساجدہ کی آنکھوں سے گرنے والے تھے لیکن منظور نے آگے بڑھ کر انہیں اپنی انگلیوں میں جذب کر لیا۔ وہ بولی۔

"میں تقدیر کی بات کر رہی ہوں جس کے آگے کبھی کبھی انسان بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔"

"تقدیر کو بدلنا ہوگا ساجدہ! تقدیر کو بدلنا ہوگا۔ اگر اس نے بھی تمہیں مجھ سے جُدا کرنے کی کوشش کی تو میں ساری دنیا کو آگ لگا دوں گا۔"

"تمہارے آگ لگانے سے بھی کیا ہوگا، ہوگا تو وہی، جو خدا کو منظور ہوگا۔!!"

"نہیں، جو منظور کو منظور ہوگا وہی ہو کر رہے گا۔ مجھے پوری امید ہے۔"

"تو کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ منظور کو کیا منظور ہے؟ ــــ" وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بولی۔

"یہی کہ تم عمر بھر کے لیے میری ہو جاؤ اور بس دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے، مجھے اس سے کوئی غرض نہ ہوگی۔" وہ ایک عزم کے ساتھ بولا۔ اور دوسرے ہی لمحے اُس کی باہوں میں ساجدہ سِسک رہی تھی۔ روتے ہوئے اُس نے کہا۔

"منظور! میرے مالک، میرے سرتاج! مجھے کبھی ٹھکرا نہ دینا۔" اور منظور کا دماغ اُس کے بالوں کی خوشبو سے معطّر ہوتا گیا۔ 'ہوں، ہاں' کے سوا کچھ اور اُس کی زبان سے نہ نکلا۔ وہ دونوں دیر تک ایک دوسرے سے گلے ملتے رہے۔

یہ رات منظور کی سب سے حسین رات تھی۔ وہ بہت خوش تھا، اتنا مسرور کہ اُس سے کوئی کام بنائے نہ بن رہا تھا۔ رہ رہ کے مسکراہٹ اُس کے لبوں کے بوسے لے رہی تھی۔ وہ کیف و سرور کے ایک ایسے دور سے گزر رہا تھا جہاں ہر طرف نور و نکہت کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے بن موسم کے بہار آئی ہو۔ جو اپنے ساتھ کامیابیوں اور کامرانیوں کا پیغام لے کر آئی تھی۔ وہ اب اس قابل تھا کہ اپنے دوستوں میں فخر سے کہہ سکے کہ ساجدہ اس کی ہے صرف اس کی۔ وہ ایک سچّا عاشق تھا اُس کی محبت میں نہ کوئی کھوٹ تھی اور نہ ہی کوئی لالچ۔

اُس کے دوست اُس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ اُن میں سے کئی نے ساجدہ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اُسے محبت کا فریب دینا چاہا تھا، لیکن

اُس نے اقرار یا انکار کرنا تو در کنار کسی کی طرف سیدھی طرح دیکھا بھی نہ تھا۔ اور صرف منظورؔ کی ہو کر رہ گئی تھی۔ دوست رشک نہ کرتے تو اور کیا کرتے، کیونکہ بہاروں کو بھی جس پھول پر ناز تھا اس پھول نے منظورؔ کو سونگھنے کا حق دیا تھا۔ اور خود بڑھ کر اُس کی طرف آیا تھا۔

اور یہی رات ساجدہ کی بھی خوشیوں کی رات تھی۔ اُس کے بھی من کی مراد پوری ہوئی تھی۔ طویل بیداری کے بعد وہ آج میٹھی نیند سو سکی تھی۔ اُس کے ساتھ سونے والی شمّیؔ نے بھی آج پہلی بار اُسے گھوڑے بیچ کر سوتے دیکھا تھا۔ ساجدہ کی اِس اچانک تبدیلی پر وہ اندر ہی اندر خوش تھی۔

جب صبح ہوئی تو ساجدہ نے خلافِ معمول شمّیؔ کو جگایا جو ہمیشہ خود اُس کو ہی جگاتی تھی۔ اور بارگاہِ الٰہی میں سر بہ سجود ہو گئی۔ اُس نے سب کے لیے یعنی گھر کے ہر فرد کے لیے دعاؤں کے دفتر کھول کر رکھ دیئے۔ سب سے زیادہ دعائیں منظورؔ کے نام کی تھیں منظورؔ جو اُس کا پیار تھا، اُس کا سب سے خوب صورت خواب تھا۔ پہلا اور شاید آخری خواب اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ یہ آنسو خوشی کے آنسو تھے، عقیدت کے آنسو تھے۔ جو اکثر کسی خوشی کو دائم و قائم بنانے کے لیے چھلکائے جاتے ہیں۔ اُس کی سب سے بڑی خوشی منظورؔ کا پیار تھا۔ جس کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھی۔ اور اُس نے یہ عزم کر لیا تھا کہ اس کے لیے وہ اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہ کرے گی۔

شمّیؔ بہت مسرور تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب اُس نے ساجدہ کا اصلی روپ دیکھا تھا۔ اُس نے جا کر ماں کو بھی اِس انہونی بات سے آگاہ کیا۔ ماں نے سُنا تو یقین نہ آیا اور دوڑ کر آئی تو دیکھا کہ جو کچھ سُنا تھا وہ سچ تھا۔ اُس اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا گویا فرطِ مسرت سے باہر نکل پڑے گا۔ آنکھیں موند لیں، شاید اِس خیال سے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ کچھ خدا سے مانگا، پھر ایک دم ساجدہ کو اپنے سینے سے لگا لیا اور دیر تک اُسے چومتی رہی۔ ہوش

ہیں آکر پہلی بار ماں کی ممتا کو ساجدہ دیکھ سکی تھی۔ پھر شمی بھی آگئی اور تینوں ماں بیٹیاں ایک ہی کمرے میں نہ جانے کتنی مدّت کے بعد دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔

دوسرے دن کسی نے آکر یہ خبر دی کہ شکیلہ آئی ہے۔ یہ سُن کر ساجدہ اچھل پڑی۔ اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ رہتی بھی کیسے، شکیلہ اُس کی سہیلی جو تھی۔ بچپن کی سہیلی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بچپن سے ہی جانتی تھیں۔ ایک ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور کام کرنے سے اُن میں اتنی محبت بڑھ گئی تھی کہ اگر کسی دن ایک دوسرے کی دید نصیب نہ ہوتی تو دونوں سے کھانا تک نہ کھایا جاتا۔

کوئی دن ایسا نہ ہوتا جس دن دونوں پہروں پاس نہ بیٹھتیں بچپن کی منزلوں کو پار کرتے کرتے دونوں کی باتیں گھر کے کام کاج سے متعلق ہوتیں۔ اور جب دونوں نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے لگیں تو یہ باتیں گھر کے کام کاج سے ہٹ کر زندگی کے دوسرے شعبوں سے متعلق ہونے لگی تھیں۔

شکیلہ کی کوئی بات ایسی نہ تھی جو ساجدہ سے چھپی ہو، اور خود ساجدہ نے اپنا رازدار اُسی کو بنایا تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ دونوں کے درمیان کوئی ایسا راز بھی نہ تھا جس کو ظاہر کر کے دونوں میں سے کوئی رسوائی کا سبب بنتی۔

شکیلہ ایک ایسے گھر کی زینت تھی جو ساجدہ کے گھر کے مقابلے میں ہر لحاظ سے اچھا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی تھی، اُسے بڑے ہی لاڈ پیار اور نازوں سے پالا پوسا گیا تھا اُس نے ساجدہ کی طرح کبھی بھوکوں رہنا نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ ہی کبھی اُس کے گھر میں ایسی نوبت آئی تھی۔ گو کہ اُس کے والد کے پاس بہت زیادہ زمین نہ تھی، اور نہ ہی آمدنی کے دوسرے خاص وسیلے تھے۔ پھر بھی ایک تو اُس کے پاس کھیتی کے لائق جتنی زمین تھی، زرخیز تھی۔ گاؤں میں سوکھا ہوتا اور اُس میں اس قدر فصلیں اُگتیں کہ آئندہ سال تک کے لیے گزارا بن جاتا۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ اُس کی سسرال

والے بڑے مالدار لوگ تھے۔ وہ اُس کی بہت مدد کرتے تھے۔ نقدی و جنسی ہر طرح سے، یہاں تک کہ زیادہ سے زیادہ فصل اگانے کے لیے کھاد اور بیج تک کے روپے وہی ارسال کرتے۔

شکیلہ جب اپنے گاؤں کے ماحول کی یکسانیت سے اکتا جاتی تو گھر والے اُسے ننہیال بھیج دیتے۔ ننہیال میں اُسے روحانی سکون ملتا تھا۔ بڑے ماما کے کہنے پر اس نے گھریلو تعلیم کے علاوہ کچھ اسکولی تعلیم بھی حاصل کرلی تھی۔ وہاں اُسے سبھی والدین سے زیادہ چاہتے تھے۔ اور پیار کرتے تھے۔ بالخصوص نانی اماں۔ اُن کا بس چلتا تو وہ اُسے والدین کے پاس جانے ہی نہ دیتیں۔ اور نانا جی بھی کچھ کم پیار نہ کرتے تھے۔ شکیلہ وہاں ہوتی تو وہ روز کوئی نہ کوئی کھلونا لاتے، پہروں اُس کے ساتھ کھیلتے، ہر پل اُسے خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ کبھی وہ باتوں سے نہ بہلتی تو اُس کا پیٹ گدگداتے۔

اِن کے علاوہ اُس کے دو ماموں اور دو خالیں تھیں۔ ایک خالہ جس کی شادی اُس کی کم سنی میں ہوئی تھی، کے سوائے گھر کے سبھی افراد اُس پر جان چھڑکتے تھے، اور زیادہ سے زیادہ اُسے آنکھوں کے سامنے رکھتے تھے۔ اِس لحاظ سے وہ قسمت والی ہی تھی۔

لیکن کہتے ہیں کہ ہر ایک کو اپنے گھر کے ساتھ زیادہ لگاؤ اور انس ہوتا ہے، اور یہ ایک فطری عمل ہے۔ شکیلہ کبھی مہینے بھر سے زیادہ ننہیال میں نہ رہتی تھی۔ اُس کا مزاج ہی کچھ ایسا تھا کہ طبیعت بہت جلد ہر چیز سے اکتا جاتی۔ گھر میں ہوتی اور کسی چیز میں کوئی فرق پڑتا محسوس کرتی تو فوراً ننہیال جانے کا مطالبہ کرتی، اور ننہیال میں دل نہ لگتا تو پھر اپنے گھر چلی آتی۔ اِس طرح اُس کا بچپن نہایت ہی شان و شوکت اور عیش و آرام میں گزرا۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ وہ گھر پر ہوتی تو اپنی صبحیں اور شامیں ساجدہ کے ساتھ گزارتی۔ اور نانی اماں کے یہاں بھی اگر اُسے کسی کی یاد آتی تو صرف ساجدہ ہی کی۔

اِس طرح اُن کا بچپن گزرتا گیا اور دونوں دھیرے دھیرے جوانی کی منزل میں

داخل ہوگئیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُن میں سے کسی کو اس پیپر کا خیال نہ تھا۔

شکیلہ ساجدہ سے چار برس بڑی تھی لیکن دونوں کو دیکھ کر کوئی یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ بڑی کون ہے یہ، یا وہ ـــــ؟، ساجدہ اپنی قد و قامت کے لحاظ سے بھاری بھرکم تھی۔ جبکہ شکیلہ دُبلی پتلی نازک سی لڑکی تھی۔ اکثر اُسے ساجدہ کے مضبوط جسم اور بھرے بھرے چہرے کی طرف دیکھ کر رشک آجاتا لیکن وہ اپنی اِس کیفیت کو ظاہر کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔

زندگی کی اس آنکھ مچولی کو کھیلتے ہوئے ایک دن ایسا بھی آیا جب اگرچہ حتمی طور پر نہیں، وقتی ہی ایک لمبی مدّت کے لیے دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا ہونا پڑا تھا۔ ساجدہ کو کیا معلوم تھا کہ شکیلہ کی زندگی کا آخری فیصلہ ہو رہا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اُس نے ماضی کے آئینے میں شکیلہ کے روشن مستقبل کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اُسے ایک طرف بہت دُکھ ہوا تھا کیونکہ اُس کے بچپن کی ساتھی ہمیشہ کے لیے اُس سے جُدا ہو رہی تھی، اُسے الوداع کہنے کو تھی۔ اُس کا دل ڈوب رہا تھا، لمحہ بہ لمحہ اداس ہوتا جا رہا تھا۔ اس کو شکیلہ کی یاد رہ رہ کے تڑپا رہی تھی۔ شکیلہ جو پھر ننھیال چلی گئی تھی۔ آج وہ دل کو بہلانے یا ماں باپ کے کہنے سے نہیں گئی تھی۔ بلکہ بڑے ماموں اُس کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ جاتے جاتے اُس نے اپنی بہن اور بہنوئی سے یہ بھی کہا تھا کہ اب شکیلہ ماشاء اللہ جوان ہو رہی ہے میں چاہتا ہوں کہ اپنے ہاتھوں اِس کی شادی کہیں طے کر کے تمہارے شانوں سے اس کا بوجھ اٹھا لوں۔ اور دونوں میاں بیوی بہت خوش ہوئے تھے۔ خوشی سے وہ کچھ کہہ بھی نہ سکے تھے۔

کہتے ہیں کہ بیٹی کی خاموشی ہی اقرار کی علامت ہوتی ہے۔ شکیلہ کے بڑے ماموں نے اُن کی خاموشی کو سمجھ لیا تھا اور ایک طرح سے اُسے اس بات کی اجازت مل گئی تھی کہ وہ شکیلہ کے معاملے میں پورا اختیار رکھتا ہے۔

شکیلہ کے والدین کو انکار کا جواز بھی کیونکر ہوتا۔ کیونکہ جو کام اُن پر واجب تھا اُسے انجام دینے کا کوئی اور اپنے اوپر ذمہ لے رہا تھا۔ لہٰذا وہ خاموش ہی رہے اور اُن کی یہ خاموشی زبان بن کر شکیلہ کے ماموں سے یہ کہنے لگی کہ جاؤ جب تمہاری یہی منشا ہے تو جو تمہاری مرضی ہو کرو۔

اس طرح شکیلہ ایک بار پھر ننہیال پہونچ گئی۔ اب اس کا دل کسی چیز سے بور نہیں ہو رہا تھا اور نہ ہی گھر کی یاد ستا رہی تھی۔ ماموں جان کے ارادے دیکھ کر اُس کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ وہ ایک نئی زندگی کا خواب جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ جس کی تعبیر مستقبل قریب میں ملنے والی تھی۔ ایک سچّی اور خوب صورت تعبیر۔

جب ساجدہ کو ان باتوں کا علم ہوا تو وہ بہت روئی تھی۔ مگر پھر یہ سوچ کر کہ آخر کار ایک عورت کا گھر سسرال ہی ہوتا ہے۔ اور یوں بھی کب تک وہ ایک دوسری کا ساتھ نبھاتیں؟ وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اور تب سے ہی اُس کے اندر بھی ایک انجانی خلش نے سر اُبھارا تھا۔ ایک سوزشِ پنہاں اُس کے دل میں بھی جاگ اُٹھی تھی۔ جس کا مداوا یہ تھا کہ کوئی پیار کرنے والا اُسے بھی ملے۔ کوئی چاہنے اور عمر بھر ساتھ نبھانے والا ملے جو منظور کی صورت میں اُسے مل گیا تھا۔

اس دوران شکیلہ کی شادی قریب ہی کے ایک بڑے گھرانے کے چشم و چراغ سے ہو گئی۔ اُس کے ننہیال والوں نے بڑی دھوم دھام سے اُس کی رخصتی کر دی۔ اپنی شادی پر شکیلہ نے اپنی سبھی سہیلیوں کو مدعو کیا تھا۔ اور بالخصوص ساجدہ کو۔ اُس کو دعوت دینے وہ خود گئی تھی۔ اور شادی میں آنے کی خصوصی منّت کی تھی لیکن قسمت کی بات یہ ہے کہ ساجدہ اس لیے نہ جا سکی کیونکہ اُس کے پاس پہننے کو اچھے کپڑے نہ تھے اور نہ ہی اُس کے والدین اس قابل تھے کہ کوئی تحفہ خرید کر اُس کے ہاتھ شکیلہ کو بھجوا دیتے۔ لہٰذا وہ نہ جا سکی تھی۔

شکیلہ کی شادی میں شرکت نہ کرنے کا اُسے بے حد افسوس تھا۔ اُس دن اُس کے دل پر شدید چوٹ لگی تھی۔ جس کا رِستا ہوا لہو وہ آج بھی اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی۔ احساسِ ندامت سے وہ زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ کس طرح شکیلہ کی پُرشکایت نگاہوں کا سامنا کروں گی، اُسے کیا جواب دوں گی کہ شادی میں کیوں شریک نہ ہو سکی ——؟

کیا اُس سے جھوٹ بول سکوں گی۔؟؟ کیا اُسے حقیقت بتا سکوں گی۔؟؟؟

سات

یہ پہلا موقع تھا جب شکیلا شادی کے بعد میکے آئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ شادی کے سات دن بعد جب ننھیال آئی تھی تو اُس نے یہ کہہ کر اُن سب کو حیرت میں ڈال دیا تھا کہ وہ ایک یا دو سال تک سُسرال نہیں جائے گی۔ دو طرفہ لاڈ پیار نے اُسے اچھا خاصا بیباک بنا دیا تھا۔ اُسے جو اچھا لگتا وہی کرتی اور جو چیز اُس کے من کو نہ بھاتی اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرتی۔ لہٰذا اُس کی ضد دیکھ کر سب خاموش ہو گئے تھے۔

ساجدہ اُس کے آنے سے خوش تو ہوئی تھی مگر شکیلہ کا سامنا کرنے کی اس میں ہمّت نہ تھی وہ اُس کے پاس جاتے ہوئے اسی لیے ہچکچا رہی تھی کہ اگر شکیلہ نے اُس کی شادی میں نہ آنے کی شکایت کی تو وہ کیا جواب دے گی؟ یہی نا کہ اُس کو تحفہ دینا تو درکنار اُس کے پاس ایسے کپڑے بھی نہ تھے جنہیں پہن کر وہ اُس کی شادی میں آسکتی ــــ ہائے اپنی قسمت پر اُسے رونا آرہا تھا۔ غریب ہونا بھی کتنا بڑا عذاب ہے۔ کتنے ارمان ادھورے رہ جاتے ہیں۔ کتنی ہی آرزوؤں کو اظہار کی زبان تک نہیں مل پاتی، کتنی ہی تمناؤں کا گلہ گھوٹنا پڑجاتا ہے۔ اُسے اپنی غریبی پر غصّہ آرہا تھا، اتنا غصّہ کہ اگر اُس کے بس میں ہوتا تو وہ خودکشی کرلیتی۔ یا چلّا۔ چلّا کر اپنی تقدیر پر روتی۔

پر وہ نہ کچھ کر پائی تھی اور نہ اب کچھ کرنے کا ارادہ تھا۔ بلکہ اس کا یہ خیال اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُس کے دل سے نکل گیا تھا۔ اور اس کی جگہ منظور کے پیار نے لے لی

تھی۔ وہ شاد ماں تھی، مسرور تھی۔ کیونکہ اُسے منظور جیسا ساتھی ملا تھا۔ ایک طرح سے وہ شادی شدہ شکیلہ کو، اگر دونوں کا آمنا سامنا ہوتا، یہ کہہ کر حیرت میں ڈالنا چاہتی تھی کہ اُسے کتنا پیارا جیون ساتھی ملا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اپنی نظروں کا انتخاب شکیلہ کو دکھا کر اپنی مثال آپ ہونے کا ثبوت دلانا چاہتی تھی۔ لیکن ایک بات دریں اثنا اُس کے ذہن میں یہ بھی آرہی تھی کہ جب دونوں کا سامنا ہو تبھی تو اطمینان سے بیٹھ کر یہ باتیں ہو سکتی ہیں نا ــــ

تبھی اُس کی ماں نے بھی اُسے شکیلہ سے ملنے اور مبارکباد دینے کے لیے کہا۔ لیکن نہ جانے کس خیال سے اُس نے سر درد کا بہانہ بنا کر وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ بہت سمجھانے بجھانے پر بھی جب وہ راضی نہ ہوئی تو شمی نے موقع غنیمت سمجھ کر جانے کی حامی بھر لی، ماں کو اُس کی یہ تجویز اچھی لگی اور اُس نے اجازت دیدی۔ شمی نے جاتے جاتے پوچھا بھی کہ وہ کوئی پیغام تو نہیں بھجوانا چاہتی ہے؟ تو ساجدہ نے مختصراً یہ کہہ کر بات ختم کرنے کی کوشش کی کہ "میری طرف سے خالی دعاؤں کے علاوہ ایک عدد مبارکباد پیش کرنا اگر وہ قبول کرے تو ــــ"

شمی چلی گئی تو وہ ماضی کی اُن یادوں میں کھو گئی جہاں اُس کے بچپن کا زمانہ چھپا ہوا تھا۔ اور اُس کی اکیلی ساتھی شکیلہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتیں ــــ وہ باتیں جو صرف گھر کے کام کاج سے متعلق ہوتیں ــــ جو اُن میں اکثر ہوا کرتیں۔

وہ اُن یادوں میں اُلجھنا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا اُس نے خیالات کے ہیجان کو دماغ سے نکال پھینکا اور نئے سرے سے منظور کے خیالات کو تازہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ منظور جو اُس کی زندگی کا سب سے خوب صورت خواب تھا۔ اچانک اس خواب نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ سامنے کھڑے ہوئے منظور نے عاجزانہ لہجے میں

ساجدہ سے پوچھا۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"

"تم نہ جانے کب سے میرے اندر آگئے ہو، میرے محبوب! باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔ نہیں تو میری جان بھی نکل جائے گی۔ اور پھر مجھے مر کر بھی قرار نہ آئے گا۔ میں بھٹکتی پھروں گی، کوچہ کوچہ تمہیں ڈھونڈتی پھروں گی۔ تمہاری جدائی میں روتی پھروں گی، آنسو بہاتی رہوں گی۔ تم مجھے چھوڑ کر کہیں چلے نہ جانا۔ تم ہمیشہ میرے پاس ہی رہنا۔"

پھر تصوّر نے زبان پائی اور عرضِ نیاز ہو گیا۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"

وہ شرما سی گئی۔ نیم وا آنکھوں سے دیکھا اور تصور سے بولی "ہائے تم نہ آتے تو نہ جانے کیا حالت ہوتی اپنی۔ یہ کیا تم ابھی تک باہر ہی کھڑے ہو، اندر آجاؤ میرے دل کے دروازے کب سے تمہارے انتظار میں کھلے پڑے ہیں۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہی ہوں، مجھے قیامت تک تمہارا ہی انتظار رہے گا۔ آہ کتنا لطیف احساس ہے یہ، کتنا پیارا خواب ہے یہ، کتنی پُرکیف ہیں انتظار کی یہ گھڑیاں، چلے آؤ۔ میرا روم روم، تمہاری یاد کو تازہ کر رہا ہے تمہارے پیکر کو نکھار رہا ہے۔ میری منتظر آنکھیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔ میں بیتاب ہوئی جا رہی ہوں۔ چلے آؤ، کہیں ایسا نہ ہو خوشی سے میرا دم ہی نکل جائے۔ میرے مالک! مجھے سنبھالو۔ مجھ سے اب میرا بوجھ نہیں اُٹھتا۔ لمحہ بہ لمحہ یہ میرا یہ بوجھ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں گر جاؤں، مجھے گرنے سے بچا لو، آؤ آگے بڑھو۔"

"میں نے کہا ہوش میں بھی ہو، یا دماغ خراب ہو گیا ہے مس لیلہ کا ——؟"

دفعتاً کسی کی گرجدار آواز کا ہتھوڑا اُس کی سماعت سے ٹکرا گیا۔ وہ ایک دم اچھل پڑی،

اور حواس باختہ ہو کر اپنے سامنے کھڑی شکیلہ کو ایسے دیکھنے لگی جیسے خلیفہ بغداد ہارون رشید کے محل میں ابوالحسن کو درباری دیکھ رہے ہوں۔

خیالات کا دریا اُسے اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہا تھا۔ اور اُسے بالکل یہ علم نہ رہا کہ وہ کہاں سے کہاں آ گئی ہے۔ بے خیالی میں وہ نہ جانے کیا کیا بک رہی تھی اور اُس کی اِس کیفیت کو شکیلہ نے اپنی ایک ہی نظر میں بھانپ لیا تھا۔ غالباً اُس نے یہ اندازہ بھی کر لیا تھا کہ اس کے پیچھے کیا راز ہو سکتا ہے۔

کئی لمحوں تک وہ ایک دوسرے کو مسلسل دیکھتی رہیں، اور پھر اچانک ساجدہ کا دل اتنا بھر آیا کہ ایک دم دوڑ کر سسکتے ہوئے اس نے شکیلہ کو گلے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُس کے آنسو، آنسو نہیں تھے خون کے قطرے تھے۔ نہ جانے وہ یہ خون کیوں بہا رہی تھی۔ شکیلہ کے آنے کی خوشی میں یا اپنا پیار دائم و قائم بنانے کے لیے۔

شکیلہ اُسے روتے دیکھ کر خود بھی آنسو بہانے لگی۔ اُسے اپنی جان سے پیاری سہیلی کی یہ حالت دیکھ کر بہت رونا آ رہا تھا۔ کافی دیر تک دونوں ایک دوسری سے لپٹی آنسو بہاتی رہیں ـــــ آخر کار ساجدہ نے خود پر قابو کیا اور شکیلہ کو تھپک کر اپنے سے الگ کرتے ہوئے مبارکباد دی۔ مگر زبان سے کچھ اور نکلا۔ "شکیلہ، میری بہن! میں تمہاری شادی میں نہ آ سکی، اس کا مجھے بے حد افسوس ہے اور اب تم سے معذرت کے سوا کر بھی کیا سکتی ہوں۔"

"یہ میری بدقسمتی تھی ـــــ" شکیلہ بدستور روتے ہوئے بولی۔ "کہ ایک وہ ہی نہ آئی جس کے ساتھ میری تمام تر خوشیاں وابستہ تھیں جس کے ساتھ میرا بچپن بیتا ہوا تھا، باقی تو سب لوگ آ ہی گئے تھے۔"

"مجھے معاف کر دو، میں نے بہت چاہا تھا لیکن حالات نے ہی اجازت نہ دی

اور کچھ اپنی بھی مجبوری تھی۔" ساجدہ پھر اُس کے کندھے سے لگ کر سسکنے لگی۔

"کون سی ایسی مجبوری پیش آئی تھی جس نے دیوار بن کر تمہارا راستہ روک لیا اور جدا ہوتے وقت تمہیں مجھ سے ملنے نہ دیا؟"

"مت پوچھو شکیلہ، مت پوچھو ـــــ" اُس کی آواز اس قدر رُندھ گئی تھی کہ کہتے نہ بنتا تھا "مت پوچھو میری بدنصیبی کی وہ باتیں جنہیں دوہرا کر دل چاک، چاک، اور جگر پارہ پارہ ہونے کا ڈر ہو۔ میں نہ آسکی یہ ایک حقیقت ہے کیوں نہ آسکی اس کا جواب دینا میرے لیے مشکل ہے۔"

"خیر تم نہ آئیں نہ سہی، ہم نے تو پوچھا نا؟"

"کس زبان سے کہوں کہ تم نے نہیں پوچھا میری بہن! لیکن دُکھ کی بات تو یہ ہے کہ میں نہ آسکی۔ اگر تم نہ بھی پوچھتیں پھر بھی مجھے تو آنا چاہیئے تھا نا؟ آہ! کتنا دُکھ ہے مجھے اِس بات کا ـــــ!!" وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔ اور اُن آنسوؤں کو سکھانے کے لیے اُس نے پاس ہی پڑی اوڑھنی کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ تبھی اُس کی نظر شمی پر پڑی۔ جو دروازے کی چوکھٹ پر ابھی تک بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ پھر ایک دم اُس کی زبان سے نکلا۔

"شمی، تم ابھی تک دیکھے جا رہی ہو، چائے وغیرہ لانے کا خیال نہیں ہے کیا؟"

"اتنی بھی کیا جلدی ہے۔" شکیلہ بھی خود کو اس دوران قابو میں لا چکی تھی۔ وہ بولی۔ "ابھی میں آئی نہیں اور تم نے تکلّف سے کام لینا شروع کر دیا۔"

"اِس میں تکلّف کی کون سی بات ہے۔ ایک مدّت کے بعد آئی ہو، کم سے کم حلق تو گیلا کرنا ہی پڑے گا۔"

"وہ تو پانی پی کر میں پہلے ہی کر چکی ہوں۔"

"پانی پینے کی بھی خوب کہی۔ پہلی بار ساجدہ کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ

آئی ہے جس میں شکیلہ آپا بھی شامل ہو گئی ہے۔"

پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی، شمی دروازے کی چوکھٹ سے جا چکی تھی۔ نظریں سمیٹ کر اور موقع جان کر اس نے موضوع بدل ڈالا۔

"کچھ اور سناؤ دن کیسے گزر رہے ہیں؟"

"تم اپنی سناؤ" ساجدہ نے الٹا سوال کیا۔ "نئی نئی دلہن ہو، نئی زندگی میں داخل ہوئی ہو۔ کیا کچھ دیکھا کیا کچھ محسوس کیا اِس نئی زندگی میں۔ میاں کیسے ہیں، کتنا چاہتے ہیں؟ کچھ تو بتاؤ۔"

"خیر یہ باتیں تو بعد میں ہوں گی پہلے اپنی سناؤ۔"

"اپنی کیا سناؤں بس سمجھو گزر رہی ہے جوں توں کر کے۔ ہاں تمہارے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ پھوٹ پڑو۔"

"ہے ——!!" شکیلہ نے اُس کے دل میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ہر چند کہ اُسے اپنی سُنانے کا بھی بڑا اشتیاق ہو رہا تھا —" بننے کی کوشش مت کرو یہ میں کیا سُن رہی ہوں؟"

"کیا سن رہی ہو تم ——؟" ساجدہ کے پیروں تلے زمین ہل کر رہ گئی۔ "کیا سُنا ہے تم نے؟"

شکیلہ نے تیر نشانے پر لگتے دیکھ کر کہا "یہی کہ تمہارے دل میں کوئی چور گھس آیا ہے۔ ایسی حالت کب سے ہوئی جناب کی؟"

"ارے شکیلہ آپا تم بھی عجب واہیات ہو۔ کون سا چور؟ کیسا چور؟ یہ سب اُس شیطان کی خالہ شمی نے تم سے کہا ہوگا۔"

"خیر کسی نے بھی کہا ہو تم سے غرض، ہاں بتاؤ اب کون ہے وہ شیطان کا نانا جو تمہارے دل میں چوری کے ارادے سے گھس گیا ہے۔ کچھ ہم بھی تو سُنیں۔ آخر بچپن

کی ساتھی ہو مجھے نہ بتاؤ گی تو اور کس سے کہو گی ؟ اب کہو بھی نا۔" اُس نے کہتے کہتے اپنی آنکھیں کچھ اس طرح گھمائیں کہ ساجدہ کو ہنسی آ گئی۔

شکیلہ اُسے ہنستے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے سوچ کے دریا میں ڈوب گئی اور یہ بات اُس کے پلّے نہ پڑی کہ ساجدہ اپنی زندگی سے خوش ہے یا ناخوش۔ ابھی کچھ دیر پہلے اُس کی آنکھوں نے دریا بہائے تھے اور اب یہ حال تھا کہ بے ساختہ ہنستی جا رہی تھی۔ شمی نے جس انداز سے شکیلہ کو اُس کی کہانی سُنائی تھی اس طرح کے آئینے میں ساجدہ کو اس روپ میں ضرور دیکھا جا سکتا تھا کہ اُس نے اپنا دل کسی کو دے دیا تھا۔ اور ظاہر ہے وہ اپنی اس حرکت سے شادماں بھی تھی۔ پھر بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے لیے اُس کے دل کو کریدنا ضروری تھا۔ چند لمحات تک مسلسل سوچنے اور غور کرنے کے بعد اُس نے ایک نیا رُخ اختیار کر لیا۔

"اچھا نہیں بتانا چاہتیں تو نہ سہی مگر کب تک چھُپائی پھرو گی اِس چور کو، جس دن یہ اپنا کام کر کے باہر آئے گا اُس دن سب کو معلوم ہو ہی جائے گا۔"

"شکیلہ ——!" ساجدہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "تم سے میں کیا چھُپاؤں تم سے ہی کیا میں تو کسی سے بھی کچھ نہیں چھُپا سکتی ہوں۔ میری زندگی ایک کھُلی کتاب ہے، اور ظاہر ہے جب کتاب کھُلی ہو تو ہر ایک کی نگاہ اُس کی طرف اُٹھنا فطری عمل ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ ایسا ہو کر بھی ہر ایک اُسے پڑھ نہیں سکتا۔ اس سے زیادہ میں اور کیا بتاؤں اگر پڑھنے والی آنکھ رکھتی ہو تو خود اندازہ لگا سکتی ہو کہ اس پر کیا لکھا ہے۔"

اُس کی یہ منطقانہ باتیں سُن کر شکیلہ کو ہنسی آ گئی۔ بڑے زور کی ہنسی، اُس نے کہا ——

"کتاب میں کچھ ایسے بھی الفاظ ہوتے ہیں جو عام انسان کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اُن الفاظ کو سلیس کر سکو ——"

"کاش کہ میں ایسا کر سکتی۔" ساجدہ نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"تم ایسا کیوں نہیں کر سکتیں؟ کتاب تو تمہاری لکھی ہوئی ہے، اُس پر عبور بھی تم ہی کو حاصل ہو گا نا۔"

ساجدہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھ کر خلاء کو دیکھا، دُور اُس کی نگاہ میں دو پرندے سما گئے، جو اُڑتے اُڑتے ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے۔ اور چھیڑ چھیڑ کر خوش ہو رہے تھے۔ اُس کے دماغ میں ایک پُرانی یاد تازہ ہوئی، ایک دن منظور نے بھی اُسے ایسا ہی منظر دکھا کر کہا تھا۔

"ساجدہ! دُور کے اُن بادلوں کو دیکھ رہی ہو جو نزدیک ہو کر بھی ایک دوسرے سے ملنے کو بے قرار ہو رہے ہیں۔؟"

"ہاں دیکھ تو رہی ہوں۔" اُس نے ایک ادائے نازنیں کی طرح جواب دیا تھا۔ "بادل کے یہ آوارہ ٹکڑے، ہمیں پیار کی مثال پیش کر رہے ہیں کہ ایک دوسرے سے جُدا نہ ہونا، عمر بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہنا، اور پھر اس نے اپنی یقین دہانی کے لیے پوچھا تھا۔

"کیا تم بھی یہی محسوس کرتے ہو؟"

"ہاں واقعی تم نے میرے دل کی بات چھین کر کہی۔ ایک دوسرے کے اتنے پاس ہو کر بھی مجھے لگتا ہے کہ ہم دُور دُور ہیں۔" وہ خیالات سے لوٹ تو آئی لیکن ابھی تک یہ سوچ رہی تھی کہ واقعی ابھی منظور اُس سے بہت دُور تھا۔ اُسے پاس لانے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا۔ لہٰذا وہ شکیلہ سے کیسے کہہ سکتی تھی کہ جو چور بقول اُس کے، اس کے دل میں گھس گیا تھا وہ چند دنوں کا مہمان تھا یا زندگی بھر اُس کے دل میں رہنے کا خواہاں تھا۔ چنانچہ اُس نے بڑے ہی فکر مندانہ لہجے میں اپنی سہیلی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"شکیلہ میری بہن، کبھی کبھی اپنی کتاب کے تخلیق کار کو بھی خود کچھ الفاظ کا صحیح

مفہوم معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا ہیں اور کیونکر اس کتاب میں جگہ پا گئے ہیں۔ اس صورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تمہیں اس بارے میں مایوس ہونا پڑے گا شاید، ہاں یہ میں بتا سکتی ہوں کہ میری آنکھوں نے ایک خواب دیکھا ہے ایک ایسا خواب جس کی تعبیر اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بُری بھی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی خواب کی دو تعبیریں ہوں اور وہ بھی اچھی یا بُری ــــ"

"یہ تو وقت ہی بتا سکتا ہے کیونکہ کل، آج اور آنے والا کل وقت ہی سے تعلق رکھتا ہے۔"

"دیکھ ساجدہ ــــ!" شکیلہ نے تنگ آکر کہا۔ "میں نے ایک سیدھی سی بات کہی تھی اور تم اتنا اُلجھ گئیں کہ اب مجھے تم پر ترس آنے لگا ہے۔ ایسا کہو کہ تم بتانا ہی نہیں چاہتی ہو۔ بس معاملہ ختم، کتاب، کھلی کتاب، تخلیق کار، مفہوم، خواب تعبیریں یہ ساری منطق نہ تو میرے دماغ میں آرہی ہے اور نہ ہی میں اِنہیں کوئی اہمیت دیتی ہوں۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ تمہیں جواب مِل گیا اپنے سوال کا ــــ" ساجدہ نے اپنا پیچھا چھُٹتا دیکھ کر کہا۔

"جواب مل گیا ــــ؟" وہ حیران ہو کر بولی۔ "وہ کیسے مِل جاتا جب تم دینا ہی نہیں چاہتیں ــــ"

پھر اس سے پہلے کہ ساجدہ کچھ کہتی، شمی چائے لے کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ دونوں اُس کی طرف دیکھنے لگیں اور اصل موضوع ادھورا ہی رہ گیا۔ چائے کے دوران رسمی باتوں کے علاوہ شمی کی موجودگی کے سبب اور کوئی بات نہ ہو سکی۔

اگلے روز جب خلافِ توقع شکیلہ نے ساجدہ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی تو والدہ کے اصرار اور اپنی دبی ہوئی خواہش کے سبب اُسے جانا ہی پڑا۔ گو کہ اُس کے دل کی سبب

تھیں وہاں جانے کے لیے نہ کُھلیں تھیں۔

وہاں جاکر وہ اپنے کو چور سا محسوس کرنے لگی۔ شکیلہ کے گھر والوں نے اور خود شکیلہ نے اُس کی اتنی آؤ بھگت اور عزت افزائی کی کہ اُسے اپنے اوپر غصّہ آنے لگا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر لحہ بہ لحہ اپنے اوپر لعنت بھیج رہی تھی کہ اُس نے اپنے دل کی بات کیوں نہ شکیلہ کو صاف صاف بتادی۔ اس سے چھپائی کیوں۔ شکیلہ اُس کی سہیلی تھی اُس کے بچپن کی سہیلی اُس کے دُکھ سُکھ کی ساتھی۔ اُس نے اپنا بچپن اسی کے ساتھ گزارا تھا۔ وہ اس کی سگی بہن کا رتبہ رکھتی تھی۔ پھر وہ اس کے سامنے پھوٹی کیوں نہ تھی، اُس نے جان بوجھ کر اپنا راز کیوں چُھپایا تھا؟ کیا شکیلہ اُس کی دشمن تھی؟ کیا وہ اُس کی خوشیاں اس سے چھین لیتی؟ کیا وہ اس کی کہانی سن کر اُس پر ہنستی؟ یا اس کی کوئی اور غرض تھی؟

کئی سوال ساجدہ کے دل میں سر اٹھانے لگے۔ اور وہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہی، خود سے اُلجھتی رہی ــــ شکیلہ اُس کی دوست تھی۔ اگر ساجدہ اس سے اپنی کہانی بتادیتی تو ممکن تھا کہ وہ اس کی مدد کرتی، منظور کو حاصل کرنے کی کوئی ایسی تدبیر بتادیتی کہ وہ عمر بھر کے لیے اس کا غلام بن کر رہ جاتا۔ لیکن اس نے ایسا نہ کیا وہ اُسے فضول سوالوں میں الجھا گئی۔ یہاں تک کہ اس نے خود ہار مان لی، اور کچھ کہنا سُننا پسند نہ کیا۔

ساجدہ سوچ رہی تھی، دل ہی دل میں مایوس ہوتی جارہی تھی۔ جو بات اُسے اپنی پہلی فرصت میں شکیلہ کو بتادینی چاہیئے تھی وہ شکیلہ کے پوچھنے پر بھی اُس نے نہ بتائی تھی۔ ہائے کتنا پرایا پن اور کتنی اجنبیت کا برتاؤ کیا تھا اُس نے شکیلہ کے ساتھ۔ خود پر آیا ہوا غصّہ شدت اختیار کرتا جارہا تھا۔ اور شکیلہ دیکھ رہی تھی کہ اُس کی سہیلی سے کچھ کہتے نہیں بن پڑ رہا ہے۔ اس نے اچھی طرح کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ خلافِ عادت کچھ چُپ

چپ سی بجھی تھی۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اور دل کچھ اس طرح سے دھڑک رہا تھا کہ سامنے والا دھڑکن کی رفتار بہ آسانی محسوس کر سکتا تھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا ساجدہ! یہ تم لمحہ لمحہ اُداس اور غمگین کیوں ہوتی جا رہی ہو ___؟" شکیلہ نے متفکر ہو کر پوچھا۔ اور پہلی بار اُس کی آنکھ بھر آئی۔

"نہیں، کچھ نہیں، میں تو اچھی بھلی ہوں۔"

"نہیں کچھ تو ضرور ہے تم ایسی تو نہیں تھیں۔ کل ہی کی طرح تم آج بھی مجھے اصلیت بتانے سے ہچکچا رہی ہو۔ آج تو تمہیں سچائی بتانی ہی پڑے گی۔ آج میں تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہوں۔"

"شکیلہ ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے ___"

"اچھا تو اُٹھو، آج کچھ دیر کے لیے پرانی یادوں کو تازہ کر لیں ___" شکیلہ نے اُس کی مضمحل طبیعت کو بہلانے کی خاطر کہا۔ اور ساجدہ اُس کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں جائیں؟" ساجدہ نے مردہ آواز میں کہا۔

"افضل باغ، کیا بھول گئی ہو کہ کبھی ہم وہاں رات گئے تک بیٹھی باتیں کرتی رہتی تھیں ___؟"

"نہیں ___ بھلا میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ افضل باغ کے ساتھ تو ہماری بڑی یادیں وابستہ ہیں، ہمارا بچپن ہی وہاں گزرا ہے۔ زندگی کا ایک خوب صورت زمانہ ہم نے وہیں بتایا ہے۔ اُسی کی سیر کرتے کرتے ہم جوان ہوئی ہیں۔"

"چلو پھر وہیں چل کر بیٹھیں۔ کچھ باتیں کریں گی تمہارے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو گا۔ اور کچھ دیر کے لیے ہی سہی ہمارا وہ زمانہ بھی لوٹ آئے گا جو جوانی کی نذر ہو گیا ہے، حالات کی بھینٹ چڑھ گیا ہے، وقت کے بدلتے تقاضوں نے جسے ہم سے چھین لیا ہے۔ آؤ چلتے ہیں۔" شکیلہ نے کہا اور دونوں کمرے سے نکل کھڑی ہوئیں۔ اُس کے پیچھے پیچھے

ساجدہ تھی جو کسی گہری سوچ میں ڈوبی نظر آرہی تھی۔ سوچ اُس کی زندگی کا سرچشمہ تھی۔ اور وہ اسی سرچشمے کو دیکھ دیکھ کر زندگی کی دھارا کو آگے لیے جارہی تھی۔

راستے میں اچانک اُسے اپنی غلطی کا پھر احساس ہوا کہ اس نے اپنے دل کی بات اپنی اتنی ہمدرد اور جان سے زیادہ عزیز سہیلی کو نہ بتا کر اس کے ساتھ ناانصافی اور اپنے ساتھ ظلم کیا ہے۔ وہ اب بھی سوچ رہی تھی کہ اسے بتائے یا نہیں۔ تبھی اس کی سماعت سے شکیلہ کی آواز ٹکرائی۔

"ہاں اب بتاؤ کیا کچھ تمہارے من میں ہے؟"

وہ دونوں باغ میں قدم رکھ رہی تھیں۔ شکیلہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے باغ کا ایک ایک بوٹا انہیں خوش آمدید کہہ رہا ہے، ہوا کے زور سے پتّے تالیاں بجا بجا کر اُن کی آمد پر خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اسی دوران ساجدہ بھی وہ راز اگل چکی تھی جو ابھی تک اس کے علاوہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ منظور۔ ساجدہ کہانی سب سے پہلے شکیلہ ہی نے سنی اور واقعی اُسے ساجدہ کی اس حرکت پر رحم آرہا تھا۔

آٹھ

ساجدہ کا خیال تھا کہ اپنے دل کی بات اپنی سہیلی کو بتا کر غم کا بوجھ کچھ کم ہو جائے گا، وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اُس کی کہانی سُن کر وہ کوئی ایسی ترکیب بنا دے گی جس سے دونوں کا پیار اپنی منزل تک پہونچنے میں کامیاب ہو سکے گا۔ لیکن اُس کی کہانی سن کر شکیلہ کے چہرے سے گہری فکر کے آثار رونما ہوئے تھے۔ وہ منظور کا نام سُن کر کچھ اِس طرح سے چونکی تھی جیسے کسی نے اس کے نازک گال پر تمانچہ مار دیا ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُس نے اوپری دل سے اُس کی اِس بات کو سراہا ہی تھا۔ کہ چلو جب تم منظور کو چاہتی ہی ہو تو کوئی مضائقہ بھی نہیں اور اس کے بعد شکیلہ کے لب نہ ہلے تھے۔

ساجدہ کا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ اپنی داستان سُنا کر وہ خود کو چور اور مجرم سا تصور کر رہی تھی۔ خاص کر اس بات سے شرمندہ تھی کہ اُس کی سہیلی نے اُس کی کہانی پر سنجیدگی سے غور نہ کیا تھا۔ ساجدہ کہتی رہی اور شکیلہ سُنتی رہی تھی۔ اور کہانی اختتام پذیر ہونے سے پہلے ہی سر درد کا بہانہ کر کے اُس نے اپنا راستہ ناپ لیا تھا۔ ساجدہ اُس کے اس طرح منہ موڑ کر جانے پر سخت خفا ہوئی تھی اُسے اِس بات کا بہت شدید احساس ہو رہا تھا کہ وہ اُس کے گھر گئی ہی کیوں تھی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اپنی کہانی شکیلہ کو سنا کر میں نے زبردست غلطی کی ہے۔

یہ غلطی اُسے رسوائی کے دہانے تک بھی لے جا سکتی تھی جس کا اُس نے فی الوقت اثر لیا تھا۔ سر دست وہ یہ سوچ سوچ کر بھی پیچ و تاب کھا رہی تھی کہ اس کی باتیں سُن کر شکیلہ کو کوفت کیوں ہوئی؟ جب کہ کل تک وہ اس داستان کو سُننے کے لیے بے چین و بیقرار تھی۔

ساجدہ کی نیندیں لُٹ گئیں۔ وہ اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگی۔ اُس کے دل میں ایک خدشہ بیدار ہوا، وہ ایک ایسے شک میں مبتلا ہو گئی تھی کہ ابھی سے اسے اپنی جان جانے کا خوف ہونے لگا تھا۔ اُسے اِس بات کا بہت ہی صدمہ تھا کہ وہ اس راز کو اپنے تک محدود رکھنے میں کوشش کے باوجود کیوں ناکام رہی تھی۔

رات بھر اُس نے کئی ڈراونے اور بھیانک خواب دیکھے۔ اُن خوابوں میں اُس نے اپنی کوئی قیمتی اور عزیز چیز کھوئی ہوئی دیکھی۔ کوئی ایسی چیز جو دنیا کی حسین ترین شئے تھی۔ جس سے اُس کی وابستگی روح اور جان جیسی تھی۔ وہ دھاڑیں مار مار کر روئی تھی۔ اُس کی آنکھیں رات بھر بھیگتی رہیں۔ سیکڑوں نالے اُس کے دل سے نِکل نِکل کر رات کی خوفناک تاریکی میں تحلیل ہوتے رہے۔ اُنہیں یا تو ساجدہ نے سُنا یا رات کی خاموشی نے۔ بڑی مشکل سے وہ رات سحر دیکھنے میں کامیاب ہوئی۔

سویرا ہوتے ہی اُس کے قدم اس مقام کی طرف اٹھنے لگے جہاں منظور اُسے ملتا تھا۔ وہ جلد از جلد اس سے ملنا اور کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ لیکن چونکہ یہ کوئی ملنے کا وقت نہ تھا اور نہ منظور کو ہی یہ معلوم تھا کہ آج ساجدہ صبح سویرے اس سے ملنے آئے گی۔ لہٰذا اُس کا انتظار طویل ہوتا گیا۔ اتنا طویل کہ اُس کا دم گھٹنے لگا۔ جب اُس کی بیقراری زیادہ بڑھنے لگی اور انتظار کے لمحے جان لیوا ثابت ہونے لگے تو وہ تیز تیز قدموں سے اُٹھ کر وہاں سے چلی آئی، دل میں یہ ارادہ کر لیا کہ اُسے کسی سے

بلوا لے گی، لیکن شاید خدا کو منظور نہ تھا۔ ساجدہ کو ایسا کوئی نہ مل سکا جس سے وہ منظور کو خبر بھیج کر بلوا لیتی۔ مجبوراً اُسے پھر واپس جانا پڑا لیکن اِس بار اُس کے قدم اُس مقام کی طرف نہ اُٹھے جہاں سے وہ کچھ دیر پہلے ہی مایوس ہو کر لوٹی تھی۔ بلکہ وہ سیدھی اپنے گھر گئی اور ایک کمرے میں دروازہ بند کر کے چارپائی پر اوندھے منھ گِر گئی۔

اُسے کسی پہلو قرار نہ تھا۔ دل رہ رہ کر قابو سے باہر ہوتا جا رہا تھا، آنکھوں میں آنسو امڈے چلے آ رہے تھے۔ ہاتھ پاؤں شل ہوئے جا رہے تھے۔ جسم کے کسی حصے میں جان باقی نہ رہ گئی تھی۔ اِس حالت میں وقت بھی بڑی سُست رفتاری سے گزرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک پل، ایک گھڑی ایک صدی کی طرح لگ رہا تھا، ہر لمحہ تشنگی کا لمحہ تھا۔ ایک طویل انتظار کے بعد دوپہر ہوئی۔ اُس نے آگے پیچھے نہ دیکھا اور یہ اتفاق ہی کی بات تھی کہ گھر کے باقی افراد کھیت پر جا چکے تھے، اُس پر قسمت کا یہ کھیل کہ جب وہ گھر سے نکلی اور اس مقام تک جانے کے لیے قدم بڑھائے تو منظور دور ہی سے آتا نظر آیا۔

ایک تبسّم، ایک شوخی، ایک ادا نے اُس کے اندر انگڑائی لی۔ ایک عجیب قسم کی خوشی اور سرور کی لہر اُس کے انگ انگ میں دوڑ گئی۔ ایک لمحے کے لیے وہ اپنے تمام غم بھول گئی۔ یہ پیار کا اثر بھی ہے اور فطرت کا قانون بھی کہ جب دو چاہنے والے آپس میں ملتے ہیں تو سارے غم مٹ جاتے ہیں تمام اُلجھنیں ختم ہو جاتی ہیں۔ پیار ایک ایسی طاقت ہے جس کے سامنے دنیا کے تمام مصائب و آلام ہیچ نظر آتے ہیں۔

ساجدہ اپنے غم کو کسی حد تک بھول گئی تھی لیکن جو خدشہ اُس کے دل میں سر اٹھا رہا تھا وہ باہر جھانکنے کے تیزی سے مچلنے لگا۔

خلافِ توقع جب منظور نے دوپہر کی تپتی دھوپ میں ساجدہ کا جلوہ دیکھا تو

وہ چند لمحات تک حیرت سے ساجدہ کو دیکھتا رہا۔ آج سے پہلے ساجدہ اُسے شام ہی کو ملتی تھی یا پھر پروگرام کے مطابق دیئے گئے وقت پر۔ لیکن چونکہ آج نہ تو ملنے کا کوئی پروگرام تھا اور نہ ہی کوئی وقت مقرر تھا، لہٰذا اُس کا حیرت میں پڑنا یقینی تھا ساجدہ اُس کے قریب تو آگئی لیکن اپنی اکھڑی ہوئی سانسوں کو جلد قابو میں نہ کر سکی اُس کو پریشان و حراساں دیکھ کر منظور اور بھی اُلجھن میں پڑ گیا۔ وہ کچھ بڑبڑا کر بولا۔

"کیوں خیریت تو ہے؟ یہ تم ہانپ کیوں رہی ہو؟"

"منظور!" کہتے کہتے اُس کے چہرے پر حجاب سا آگیا۔ شرم آنی بھی چاہیئے تھی ایک یہ وقت ملاقات کا نہ تھا، دوسرے اُس کے دل میں جو ہلچل مچی تھی اُس نے اُس کی حالت غیر کر رکھی تھی۔ اس اندرونی خلش کو وہ جلد از جلد مٹانے کے درپے تھی۔

"منظور ـــ! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" بمشکل تمام وہ کہہ سکی۔ اور منظور جو کہ پہلے ہی سے حیرت زدہ تھا، معاملہ پیچیدہ دیکھ کر اور بھی گھبرا گیا لیکن ہمّت کر کے بولا۔

"ایک کیوں، تم ایک ہزار باتیں کرو مگر یہ تو بتاؤ کہ ہوا کیا ہے تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

بات کہنے کو تو ساجدہ کا دل مچل رہا تھا۔ مگر اب یا تو الفاظ نہیں مل رہے تھے یا منہ میں زبان ہی نہیں رہی تھی جو اس خدشے کو بیان کرتی۔ بے بسی کا یہ عالم دیکھ کر ساجدہ کی آنکھ بھر آئی۔ دو موٹے موٹے آنسو اُس کی پلکوں سے ڈھلک کر نرم گالوں کو چھوتے ہوئے منظور کے اس رومال بھرے ہاتھ کی زینت بن گئے جسے وہ آگے بڑھا رہا تھا۔ اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔

"ساجدہ سچ سچ بتاؤ کہ بات کیا ہے۔ دیکھو میرا امتحان لینے کی کوشش مت کرنا۔ امتحان دینے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ خدارا جلدی بتاؤ کہ بات ہے کیا جو تم

اِس طرح آنسو بہانے لگیں۔

"میری سمجھ میں خود بھی نہیں آ رہا ہے کہ بات حقیقت میں ہے کیا۔" اُس نے ہکلاتے ہوئے کہنے کی کوشش کی۔ "میں نے رات بہت بھیانک خواب دیکھے۔ میں بہت جذباتی لڑکی ہوں منظور! میرا احساس مجھے مارے ڈال رہا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ آخر میں کیا کروں؟"

"میں تمہارے جذبات و احساسات کی اپنی جان سے زیادہ قدر کرتا ہوں، ساجدہ! اور کرتا رہوں گا۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ ایسا بھی کوئی خواب ہے جو میرے پیار کو بُری نگاہ سے دیکھے؟ کم سے میں تو یہ ماننے کا قائل نہیں ہوں اور نہ ہی کبھی مان سکتا ہوں یہ تم جانتی ہی ہو۔"

"ہاں وہ تو میں جانتی ہوں لیکن اس کا کیا کروں کہ میں نے خواب میں اپنی کوئی حسین شئے کھوتی ہوئی دیکھی ہے۔ اور میری سب سے زیادہ قیمتی شئے منظور تم ہو صرف تم ....."

وہ اس سے آگے کچھ نہ بول سکی اور ہچکیاں لینے لگی۔ منظور کے ہاتھ سے بھی ضبط کا دامن چھوٹنے لگا۔

"ارے پگلی میں کھو جاؤں گا کیا؟ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ کہیں کچھ اور تو نہیں دیکھ لیا ہے۔ منظور نے انتہائی شفقت آمیز لہجے میں اُسے تسلّی دی۔ "چلو پونچھ ڈالو یہ آنسو، اور مسکرا دو۔ جب اچانک ملاقات ہو ہی گئی ہے تو کیوں نہ یہ پل یہ لمحے ہنس کھیل کر گزاریں، ہوں؟"

"خدا تمہیں سلامت رکھے، میں تو تمہیں خواب میں بھی کھونا نہیں چاہتی میں تمہارے بغیر اب ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتی ہوں۔" ساجدہ سسکیوں کے درمیان بولی۔ اور خود پر قابو پانے کے لیے مسکرانے کی کوشش کی۔ پہلے تو

مسکرا نہ سکی، مگر بعد میں جب منظور مسکرا دیا تو وہ بھی اُس کی مسکراہٹ میں شامل ہو گئی۔

اسی دوران منظور نے آگے چلنے کا اشارہ کیا اور وہ دونوں ایک تاریک گوشے کی طرف چل پڑے۔ یہاں پہنچ کر دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کیونکہ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں سے کسی کا گزر تو کیا کسی کی نظر تک نہ پہنچ سکتی تھی دونوں بید کے درخت کے نیچے ایک دوسرے کے قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ ساجدہ نے درخت سے ٹیک لگایا اور منظور پہلے کی طرح اُس کے زانوں پر سر رکھ کر لیٹا رہا۔ ایسے میں اُسے سکون مل رہا تھا۔ ایک ابدی سکون۔ چنانچہ چند ثانیوں کے بعد اُس نے پوچھا۔

"تمہاری حالت بتا رہی ہے ساجدہ کہ تم نے اپنے دل کی بات کسی اور سے بھی کہہ دی ہے۔ جس کا تم کو سخت صدمہ ہو رہا ہے۔ کیوں...؟ میں نے ٹھیک کہا نا......؟"

"ہاں ——!" وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ "جو کچھ مجھے فی الوقت کسی سے کہنا نہیں چاہیئے تھا وہ راز میں اُگل چکی ہوں۔ مجھے بہت ہی رنج ہو رہا ہے یہ سوچ سوچ کر، اور رات والے خواب بھی اِسی ضمن میں آتے رہے ہیں۔"

"میرے خیال میں تم نے بہت اچھا کیا۔"

"وہ کیسے ——؟" وہ حیرت زدہ سی ہو کر پوچھ بیٹھی۔

"وہ اِس لیے کہ جب ہمارے پیار کے چرچے ہوں گے تب ہی تو بات آگے بڑھ سکتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن بے جا چرچے بھی تو اچھے نہیں ہوتے ہیں نا۔ میں تو بہت ڈر رہی ہوں چرچا ہونے سے۔"

"اچھا اتنا تو بتاؤ کہ وعدے پر قائم ہو اپنے کہ ——؟"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میری جان تمہارے ہاتھوں میں ہے اور تم یہ کہتے ہو کہ کیا میں اپنے وعدے پر قائم ہوں ــــ"

"تو کیا پھر ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اِن پیریوں سے ہمیشہ کے لیے بچ جائیں۔"

"وہ کِس طرح ــــ؟ راز تو میں پہلے ہی افشاں کر چکی ہوں، اور اپنی اِس غلطی پر میں بہت شرمندہ ہوں۔"

"کِس سے کہی تم نے یہ داستان ــ؟"

"ایک ایسی لڑکی سے جو ظاہری طور پر سُنتے سُنتے لطف تو لیتی رہی مگر اندر ہی اندر مجھے اُس کا دم سا نکلتا محسوس ہو رہا تھا۔"

"کیا کوئی لڑکی تھی وہ ــــ؟" بات کا مفہوم سمجھ کر بھی منظور نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس دلچسپ بات کو سُننے کے لیے بے تاب سا ہو رہا تھا۔

"لڑکی نہیں ہے ــــ" ساجدہ نے جواب دیا، "بلکہ ایک عورت ہے۔ ایسی عورت جس کو اپنے پیار کی بات بتا دینے کے لیے میں پہلے تو بے تاب ہوئی تھی لیکن بعد میں پچھتاوے کا رونا رو پڑی۔"

"لڑکی نہیں ہے وہ عورت ہے یہ تم نے کیا کہا ــ؟ کیا عورت لڑکی نہیں ہوتی ــ؟"

"نہیں عورت اور لڑکی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ لڑکی ہم اُس کو کہتے ہیں جو غیر شادی شدہ ہو، اور عورت کا شادی شدہ ہونا تو لازمی عمل ہے۔"

"خوب ــــ!" منظور نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جِسے تم نے اپنی داستان سنائی ایک شادی شدہ عورت ہے۔"

"ہاں ــــ" وہ مختصراً بولی۔

"کیا نام ہے اس کا؟ کون ہے وہ۔"

"یہ تو میں نہیں بتا سکوں گی ـــــ" وہ شوخی سے بولی۔ "وہ بتانے کی نہیں دیکھنے کی چیز ہے۔ کبھی موقع ملا تو میں اس سے ملا دوں گی تمہیں۔"

"اچھا ـــــ" منظور یہ کہہ کر جھینپ سا گیا۔

"ہاں ـــــ" ساجدہ نے خفت مٹاتے ہوئے سلسلہ جاری رکھا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ ہمیں کب تک چھپ چھپ کر ملنا پڑے گا، کیا اب کوئی حل آپ کے پاس ایسا موجود نہیں ہے جس کے ذریعے یہ دوریاں مٹ سکیں؟"

"ایک حل میرے پاس ہے تم چاہو تو بتا دوں۔"

"تو نیک کام میں دیر کیوں۔ بقول آپ کے۔" وہ چہکی۔

"ہم دونوں اب شادی کر لیں گے۔" منظور ایک عزم کے ساتھ بولا اور یہ بات سن کر ساجدہ کچھ اور ہی دلکش نظر آنے لگی۔ اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں وہ دراصل اسی ایک لفظ کو منظور کی زبان سے سننا چاہتی تھی۔ اور جب اس کا ذکر آ ہی گیا تو وہ خوشی سے آپ آپ نہ ہوتی تو اور کیا ہوتی۔

"منظور! تم مجھ سے شادی کرو گے، سچ کہتے ہو نا؟" خوشی سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اور پھر وہ دوسرے ہی لمحے منظور کی باہوں میں سسک رہی تھی۔

"یہ کیا، تمہاری آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔" منظور نے باہوں کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے پوچھا۔ اور وہ سمٹ کر بولی۔

"یقین نہیں آتا کہ ایسی خوشی بھی مقدر میں لکھی ہے۔"

"یقین کو اور مستحکم بناؤ۔ پیار کو اپنی آخری منزل تک لینا ہی پڑیگا نا۔"

"خدا وہ دن جلدی لائے میرے دوست اور ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے

کے ہو جائیں۔" وہ آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھ کر بولی۔" ابھی کتنا انتظار اور کرنا پڑے گا؟"

"وہ دن دور نہیں، بہت جلد میں اپنے گھر والوں کو تمہارا ہاتھ مانگنے کے لیے رضامند کروں گا اور پھر خوشیوں کا ناچتا تھرکتا چاند میرے اور تمہارے لیے چمکتا نظر آئے گا۔" اس نے کہا، اور دونوں دیر تک ایک دوسرے سے لگے رہے۔

ساجدہ کے دن عید اور راتیں شب راتوں سے کم نہ تھیں۔ جس بات کو ظاہر کرنے کے لیے اس کے لب ایک مدّت سے تشنہ تھے وہ آخر کار اس کی چاہت کے مطابق منظور ہی کے حلق سے ابھری تھی۔ اسے اب اس چیز کی کوئی فکر نہ تھی کہ کوئی اس کے خوابوں کا محل مسمار کر سکے۔ وہ شادماں تھی، منظور اُس کا تھا۔ صرف اُسی کا۔ دنیا کی کوئی طاقت، کوئی ضابطہ اُسے چھین کر نہ لے جا سکتا تھا۔ خود اس نے شادی کی بات کہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی نگاہیں صرف ساجدہ پر ہی مرکوز تھیں۔ وہ کسی اور کو نہ دیکھ سکتی تھیں۔ ساجدہ اس کے خوابوں کی ملکہ تھی۔ وہ بس اسی کا ہو کر رہ گیا تھا۔ کوئی دوسری اس کے من کو بھاتی بھی کیوں کر۔

ساجدہ نے کئی طریقوں سے اپنے گھر والوں کو بھی اپنے پیار کے متعلق جانکاری فراہم کی۔ اس کا باپ ان معاملات میں بظاہر ایک لاابالی سا آدمی تھا۔ مگر اس کی ماں نے چونکہ اپنی بیٹی کی بھاگیانہ حالت دیکھ کر پہلے اثر لیا تھا اور اب وہ اس کی طرف سے زیادہ چوکنّا ہو گئی تھی۔ دن رات غور کرتی کہ کوئی حل نکل آئے۔

دوسری طرف شکیلہ بھی چوکنّا تھی۔ جب سے اس نے ساجدہ کی زبانی اس کی کہانی سنی تھی تب سے اس کی آنکھوں کی نیند اور دل کا چین لُٹ چکا تھا۔ ہر چند کہ وہ ایک شادی شدہ عورت تھی اور شادی شدہ عورت کو چاہیئے کہ جو

کچھ بھی اس کے مقدر نے اسے دیا ہو، اس پر قناعت کرے۔ یا پھر اپنے خاوند سے بے وفائی کرتے وقت خدا کے قہر و عتاب سے ڈرے۔ لیکن یہاں معاملہ یہ تھا کہ وہ ایک ایسے گھر میں بیاہی گئی تھی جہاں ہر قسم کا آرام میسّر تھا۔ لوگ بڑے ہی ٹھاٹھ قسم کے تھے۔ خود اس کا میاں نئی فصل سے تھا اور پھر بھی وہ ساجدہ کی دوست ہو کر بھی اس کے آئیڈیل کے دل ہی دل میں پیچھے لگی تھی۔ اور اس موقع کی تلاش میں تھی کہ کب منظور سے اس کا سامنا ہو ـــــ نہ جانے کیا ہو گیا تھا اُسے۔!!

انسان چونکہ کوئی ایسی چیز بھی نہیں جسے صندوق میں چھپا لیا جائے، اگر ایسا ہوتا تو ساجدہ منظور کو اس طرح سے چھپاتی کو یا کسی کو گمان بھی نہ ہوتا کہ اس صندوق میں بھی کچھ ہے یا نہیں۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا شکیلہ کو زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ گو کہ وہ اس کے تعاقب میں تھی ہی، اور بار بار اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایک بار منظور کو تصوّر کی ان آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کرے جن آنکھوں سے وہ پہلے ہی دیکھا اور آزمایا جا چکا تھا۔

اب جبکہ اس نے اپنی پڑھائی کو نویں جماعت سے ہی خیر باد کہہ دیا تھا اور یہ حتمی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آگے اس کی آزمائشوں سے نہیں گزرے گا تو اُس کے گھر والوں نے اُسے کپڑے کی دکان سونپ دی۔ ہر چند کہ وہ پہلے اس کام کو کرنے سے گریز ہی کرتا رہا لیکن بالآخر وہ راضی ہو ہی گیا۔

کئی دنوں سے وہ اس راہ سے گزر رہا تھا۔ دکان سے گھر اور گھر سے دکان پر جانے کا یہی ایک واحد راستہ نہ تھا، وہ چاہتا تو دوسری راہ سے بھی جا سکتا تھا مگر چونکہ اس راستے سے گزرتے وقت کبھی کبھی اسے ساجدہ راکھ کے ڈھیر پر راکھ لاتے ہوئے مل جاتی تھی اور دونوں دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ لہٰذا اس نے آنے جانے کا یہی راستہ اختیار کر لیا تھا۔

آج بھی اسے یقین تھا کہ ساجدہ مل جائے گی اور جب دور ہی سے اس نے لڑکی کے کسی ہیولے کو ماہتاب کی طرح نکلتے دیکھا تھا تو اس کی آنکھیں ایک نئے ہی روپ نئے ہی لباس اور نئی ہی صورت میں ساجدہ کو دیکھ کر چکا چوند ہو گئی تھیں وہ بڑی آب و تاب کے ساتھ آگے قدم بڑھاتا ہوا آرہا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ہمیشہ اپنی محبوبہ کو اسی طرح بنتے سنورتے دیکھے۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ آج کوئی نئی بات ہے نئی بات نہ ہوتی تو ساجدہ اس طرح سے زرق برق ملبوسات زیب تن کئے ہوئے نہ ہوتی۔ اس سے قبل وہ کبھی نئے کپڑوں میں نظر نہیں آئی تھی اور نہ کبھی بن سنور کے نکلی تھی۔ اس طرح کا یہ پہلا موقع تھا ـــــ منظور یہی سوچتے سوچتے قریب آتا جا رہا تھا۔ آج وہ بہت ہی خوش تھا، بہت ہی مسرور۔ آج اُسے اس چیز کا احساس ہو رہا تھا اور صحیح معنوں میں ہو رہا تھا کہ بات کو گھر والوں کے ذریعہ آگے بڑھا کر وہ ساجدہ کے اس بوجھ کو اپنے کندھوں پر لے گا جس بوجھ کو وہ خود اٹھا نہیں سکتی ـــــ وہ قریب آیا تو اس کی محبوبہ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ کل پرسوں ہی اس نے ساجدہ سے ایک وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو اس شادی کے لیے رضامند کرے گا، اور ساجدہ کے گھر سگائی کا پیغام بھجوا دے گا لیکن ابھی وہ اپنی بات کو کچھ ایک وجوہ کی بنا پر حلق سے نہ اُبل سکا تھا اور تبھی ساجدہ نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ مسکراہٹ کے دوران ہی اُس نے آہستہ سے پکارا۔

"ساجدہ!!"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور بالکل ساکت رہی۔

"ساجدہ ـــــ! میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے خفا ہو، کیونکہ میں ابھی تک تمہارے گھر کوئی آدمی نہ بھجوا سکا۔ لیکن دیکھو نا کچھ مجبوریوں کے سبب میں ایسا نہ کر

سکا، ورنہ بات پکّی ہوگئی ہوتی۔ اب صرف چند ہی دنوں کے اندر اندر ۔۔۔۔"

اس کی بات اس وقت ادھوری رہ گئی جب جسے وہ ساجدہ سمجھ رہا تھا نے منہ اس کی طرف کر لیا۔ اس پر ایک بے وقت کی بجلی چمکی، دور کہیں سے بادل گرج اٹھا، اور دھیمی دھیمی بوندا باندی میں وہ ساجدہ کے بجائے کسی اور کا رخِ روشن دیکھ رہا تھا۔ حسین حسین سا چہرہ، گہری گہری سی آنکھیں، برق کی طرح چمکتے ہوئے دانت، شرابی ہونٹ، گلابی رخسار اور بہکی ہوئی چال دیکھ کر وہ بے خود سا ہو گیا۔ واقعی اس کے سامنے قدرت کا ایک اور شاہکار تھا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ اگر اس گلی میں کوئی ساجدہ کے بعد دل کو موہ لینے والی اور ہوش اڑانے والی حور، شمائیل ہے تو وہ یہی ہے۔ بہت دیر کی خاموشی کو توڑتے ہوئے اس نے شرابی ہونٹوں کو جنبش دی۔

"میں تمہارے گھر ابھی تک کوئی آدمی نہیں بھجوا سکا، دیکھو نا کچھ مجبوریوں کے سبب میں ایسا نہ کر سکا، ورنہ بات کب کی پکّی ہو گئی ہوتی، اب صرف چند ہی روز کے اندر اندر ــــــــ" "یعنی کس کو سمجھ کر آپ نے یہ باتیں کیں ـــ؟"

منظور آب آب ہو گیا۔ اس کو اب ہوش آیا کہ جو بات اس کے حلق سے نکلی تھی وہ کسی دوسری کے لیے کہی گئی تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ سامنے ساجدہ ہے کھسیا کر بولا "وہ کیا ہے کہ ۔۔۔۔۔"

"کسی کی شادی کی بات ہو رہی تھی شاید ــــ" اس نے کاٹ کر کہنا شروع کیا ــــ "آدمی تو شادیوں اور کئی ایسے ہی کاموں کے لیے بھجوا دیئے جاتے ہیں، آپ کس کی شادی کروا رہے ہیں، اپنی یا کسی اور کی ـــ؟"

"کیا ہے کہ ۔۔۔۔" وہ بڑی مشکل سے مسکرا دیا۔ "میں سمجھا کوئی اور ہے، غور سے دیکھا کوئی دوسرا نظر آیا۔"

"دوسرا نہیں ـــــ دوسری کہیئے۔"

منظور کچھ زیادہ ہی شرمندہ ہوگیا۔ واقعی اس نے دوسری کے بدلے دوسرا استعمال کیا تھا۔ لجاجت سے بولا ـــ "ہاں ٹھیک کہا، میں دراصل کسی اور خیال میں گم ہوں ـــــ ہوش و حواس منتشر ہیں۔"

"پیار میں لوگوں کی ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے۔ ورنہ ابھی تک میں آپ کو یاد ہوتی۔"

"یعنی ـــــ؟" وہ حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگا۔ "میں سمجھا نہیں۔ کہیں آپ ......!" وہ ذہن پر زور دے کر بولا۔ "کہیں آپ ......"

"میں کہیں آپ نہیں ہوں، میرا نام شکیلہ ہے۔ سمجھے آپ کہ پھر سے سمجھا دوں ـــــ"

"سمجھ گیا، یاد دلانے کے لیے شکریہ۔"

"تو اب بتایئے کس کی شادی کروا رہے ہیں صاحبِ عالم!"

منظور اب اس کی باتوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ وہ اصل میں اس کے حُسن سے محظوظ ہو رہا تھا۔ غور سے دیکھنے کے بعد شکیلہ اُسے زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ بلکہ وہ یہ بھی در پردہ اتنا سوچ رہا تھا اور شاید دیکھ بھی رہا تھا کہ ساجدہ کے مقابلے میں شکیلہ کی اداؤں میں جان ہے۔ وہ خوب صورتی کا بولتا ہوا شاہکار تھی جبکہ ساجدہ حُسنِ مردہ۔

ان چند ہی لمحات میں اس کے خیالات یکسر بدل گئے۔ اس کے دماغ سے ساجدہ کا تصوّر رفتہ رفتہ پھیکا پڑنے لگا اور اس جگہ شکیلہ نے اپنی داغ جمانی شروع کر دی۔

"شکیلہ جی ـــــ!" وہ عالمِ خیال میں کھویا ہوا بولا۔ "کب آگئی ہیں آپ۔ میں

نے تو سُنا تھا کہ آپ کی شادی ہو چکی ہے۔"

"تو کیا شادی کوئی قید خانہ ہے جس سے آدمی کو باہر نکلنے کی اجازت نہ ہو ــــــ؟" وہ الٹا سوال کر بیٹھی۔ تو منظور کو اس کی حاضر جوابی پر فخر محسوس ہوا۔ وہ لطف لیتا ہوا بولا ـ

"قید خانہ تو نہیں، میں نے ایسا کب کہا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ شادی شدہ عورت کا جینا گھر کی چار دیواری تک محدود ہوتا ہے۔ اِس بات سے ضرور کم از کم آپکو اتفاق ہوگا۔"

"نہیں قطعاً اتفاق نہیں ہے۔ عورت لفظ کا استعمال کر کے پہلے تو آپ نے میری دوشیزگی کا مذاق اڑایا ہے اور دوسرے یہ کہہ رہے ہیں کہ مَیں گھر کی چار دیواری میں قید ہو کر زندگی بسر کرنے سے اتفاق کروں۔ ارے خاک ہے ان کی زندگی جو آپ کی طرح سوچیں، اور عمل کریں تو انہیں چُلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیئے۔ کیا سمجھے آپ۔"

"کچھ سمجھ گیا ہوں اور کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"لیکن آپ پھر بھی کچھ نہیں سمجھیں گے۔"

"کیوں ــــــ؟" تیر پر تیر پھینکتے دیکھ کر اُس نے پوچھا۔

"کیونکہ آپ ...... آپ ذوقِ جمال کو ابھی تک سمجھ ہی نہیں پائے ہیں۔ آپ کی نظریں محدود ہیں، بہت ہی محدود۔ شاید کسی بنائے ہوئے دائرے میں بھٹک رہے ہیں آپ۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ ایک مَیں ہی کیا دنیا کا ہر آدمی ایک مخصوص دائرے میں بھٹک رہا ہے۔ حد سے بھی تو نہیں گزرنا چاہیئے نا۔ اور یہ آپ نے کیا کہا کہ ذوقِ جمال کو ابھی تک سمجھ نہیں پایا ہوں۔"

"جب آپ اس بات کا اقرار کر ہی رہے ہیں کہ ایک مخصوص دائرے میں گھوم

رہے ہیں۔ آپ گھوم کیا رہے ہیں قید ہیں آپ کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ ذوقِ جمال کیا چیز ہے۔"

"اگر آپ کا اشارہ کسی کو چاہنے سے ہے تو میں یہ بتادوں کہ....."

اس کی ادھوری بات شکیلہ نے پوری کر دی ـــ" کہ آپ ساجدہ کو چاہ رہے ہیں۔ یہی نا ـــ؟"

"ہاں ـــ!" کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس نے کہا "مگر آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا، حیرت ہے۔"

"حیرت کیوں؟ کیا یہاں کی نہیں ہوں میں، کیا میں یہاں کی آب و ہوا سے ناواقف ہوں۔ کس موسم میں آدمی کو زکام ہو جاتا ہے اور کون سا موسم سر درد کی سوغات لے کر آتا ہے، یہ دیکھتے دیکھتے ہی تو میں نے جوانی کی منزلوں میں قدم رکھا ہے۔"

"بڑی دلچسپ باتیں کر رہی ہیں آپ۔" منظور نے اس کو پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آدمی کو کب زکام ہوتا ہے اور کون سا موسم سر درد کی سوغات لے کر آجاتا ہے، خوب کہی آپ نے تو۔"

"ذرّہ نوازی ہے آپ کی ـــ" شکیلہ لکھنوی انداز میں سر جھکا کر بولی ـــ"ورنہ میں کس قابل ہوں۔"

"من کی مراد پانے والے تو خوش نصیب ہوتے ہیں، پھر بھی آپ کہہ رہی ہیں کہ کس قابل ہوں۔"

"میں......نے کون سی مراد پائی ہے ـــ" وہ کچھ اداس لہجے میں بولی۔

اُسے اداس ہوتے دیکھ کر منظور نے تیر پھینکا ـــ "کیوں اس عمر میں جو شادی ہوئی ہے اور پھر وہ بھی اچھے گھر کے اچھے لڑکے کے ساتھ۔"

"اِس عمر میں شادی ہو جانا تو کوئی معجزہ نہیں ہے، ہاں یہ آپ نے کیسے اندازہ لگایا کہ مجھے اچھا ساتھی مِلا ہے۔ جبکہ ایسا بالکل نہیں ہے۔"

"تو گویا گھر تو خوب مِلا، گھر والوں سے بیر ہے، واللہ بڑی پُر مذاق عورت ہیں آپ ——!"

"پھر وہی عورت کہا آپ نے ——"

"لاحول ولاقوۃ ——" وہ عجیب سا منہ بنا کر بولا "تو کیا آپ عورت بھی نہیں ہیں —— پھر کیا ہیں آپ ——؟"

"ابھی میری دوشیزگی باقی ہے۔ ابھی میں عورت نہیں بنی ہوں ——" وہ کچھ اس طرح سے بولی کہ منظور اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"ساجدہ تو کہہ رہی تھی کہ جب لڑکی کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ عورت بن جاتی ہے۔ ایک تم ہو جو شادی کے بعد عورت سے دوشیزہ بن گئی ہو۔"

"ساجدہ، ساجدہ، ساجدہ ——" پہلی بار منظور کو آپ کے بدلے تم کہتے سُن کر وہ کسی حد تک خوشی سے بھر گئی —— "ایک ساجدہ ہی کے نقش تو تمہارے دل و دماغ پر چھا گئے ہیں۔ کسی اور کے لیے تمہارے پاس وقت ہی کب ہے سوچنے کا۔"

"میں سوچوں بھی تو اس سے کیا ہوتا ہے۔" منظور اب اس کے من میں جھانک کر دیکھ چکا تھا کہ وہاں کیا ہے۔ اور دیکھ کر تذبذب میں پڑ گیا تھا کہ بات کہیں بڑھ نہ جائے۔ حالانکہ بات لمحہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ جس حد تک وہ اسے مختصر کرنے کی کوشش کر رہا تھا اُس سے کئی گنا زیادہ شکیلہ اس پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ اور گہرائی سے دیکھا جاتا تو وہ اس کے آگے اپنی ہار ماننے کو بیقرار تھا۔ اور یہ کہنے کے لیے اگرچہ اُسے الفاظ نہ مل رہے تھے کہ شکیلہ تم سب سے بڑی ہو، یہ کیا جادو کر دیا تم نے، میرے تو پیر ہی پھسلتے جا رہے ہیں۔ میں تمہاری آنکھوں میں پیار کی ایک موہوم

سی جھلک دیکھ رہا ہوں۔ کہیں تم مجھ سے محبّت تو نہیں کرنے لگی ہو۔؟' وہ یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ شکیلہ بولی۔

"آپ جب کچھ سوچتے ہی نہیں تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس سے کچھ نہ ہوگا۔ فی الحال آپ اس دائرے سے نکلنے کی کوشش تو کیجئے۔ جس میں آپ نے خود کو قید کر لیا ہے۔ اور دیکھئے کہ دنیا کتنی رنگین ہے، کتنی دلکش اور لطف اندوز ہے۔"

"کوشش ضرور کروں گا۔" وہ مسکراتا ہوا بولا۔

"کوشش کیا ارادہ کر لیجئے اور للّٰلہ کسی اور کو بھی ساجدہ کے علاوہ نظرِ عنایت کا شکار ہونے کا موقع دیجئے۔" بات وضع دار بھی تھی اور وزن دار بھی، جسے منظور ایک دم سمجھ گیا۔

"اگر شادی کے بعد بھی کسی عورت کو محبّت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو میرے خیال میں تم وہ پہلی عورت ہو۔"

"پھر وہی عورت ۔۔۔۔۔" وہ بناوٹی غصّہ سے بولی۔ حالانکہ اس کے اندر ایک ایسے جذبے نے سر اٹھایا تھا جو اسے لمحہ بہ لمحہ بے بس کرتا جا رہا تھا۔

"میں نے پہلے بھی کہا اور اب بھی کہتی ہوں کہ میں عورت نہیں ہوں، اور نہ ابھی عورت بننے کا کوئی شوق ہے۔ نہ میں وہ پہلی جیسی دوشیزہ ہوں جسے شادی کے بعد بھی کوئی محبّت کی نگاہ سے دیکھنے کا مشتاق ہو۔"

"کم سے کم میرے لیے تو تم وہی پہلے جیسی ہو، ۔۔۔۔۔" وہ اس وقت بھی عورت کہنے لگا تھا لیکن اسے جلد ہی یاد آ گیا اور اس لفظ کے استعمال سے باز رہا، "یعنی ویسی ہی جو کسی کے دل میں پیار کا دیا جلا بیٹھے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم ہار تو گئے لیکن سیدھے طریقے سے ماننے کو تیار نہیں ہو۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

سچ تھا وہ ہار گیا تھا۔ اور اپنی اس ہار کو زبان دینے سے فی الوقت قاصر تھا۔ شکیلہ کا پیار اس کی رگ رگ میں اِن چند ہی لمحات میں سرایت کر چکا تھا۔ اور وہ اس کو دیکھتے ہوئے بھول رہا تھا کہ زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ وہ کسی اور دے چکا تھا۔ دکان دیر سے کھل جانے کا خیال نہ گزرتا تو وہ شام گئے تک شکیلہ کی پیار بھری میٹھی میٹھی باتیں سُنتے تھک نہ جاتا۔ تبھی دوسرے دن ملنے اور باتیں کرنے کا وعدہ کر کے وہ دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔

نو

شکیلہ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر منظور کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی تھی۔ ایک زمانہ وہ تھا جب وہ ایسی ہی بے قراری، ایسی ہی لگن صرف ساجدہ کے لئے اپنے دل میں رکھتا تھا۔ دونوں کا پیار اس طرح پروان چڑھا تھا کہ اب شادی تک بھی بات پہونچ گئی تھی۔ ساجدہ نے کئی طریقوں سے اپنے والدین کو اس بات کا احساس دلایا تھا کہ وہ جلد از جلد اس کی خانہ آبادی کا خیال کریں۔ اور نسبت ٹھہرانے کا اس نے ایک سُراغ بھی بتا دیا تھا۔ حالانکہ ایک مدّت تک اس کے والد نے اسے ایک فضول سا خیال تصوّر کر کے بات کو جڑ سے ہی اکھاڑنے کی کوشش کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی اتنی پہونچ اور ایسی حیثیت نہیں ہے کہ اپنی مفلس بیٹی کے لیے منظور جیسے لڑکے کے خواب دیکھے۔ کہاں اس کی غریب اور نادار بیٹی ساجدہ اور کہاں منظور۔ اور جس چیز تک انسان کی پہونچ نہ ہو اُسے حاصل کرنے کا خیال دل میں لانا گناہ ہے۔ لہٰذا کئی دنوں تک اس نے ان باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی تھی لیکن دوسری طرف اس کی بیوی برابر ضد کر رہی تھی کہ یہ وہ پرانا زمانہ نہیں ہے جب لڑکیوں کو اس بات کی خبر تک نہ دی جاتی تھی کہ انہیں عمر بھر کے لیے جس کے حوالے کر دیا گیا ہے وہ انسان ہے یا حیوان۔ یہ وہ زمانہ نہیں، جب خاندانی وقار کو مدِ نظر رکھ کر ہی ایسے رشتے طے ہو پاتے تھے۔ آج کا

وقت، آج کا زمانہ دوسرا ہے۔ اب وہ پُرانے دقیانوسی اور فرسودہ خیالات نہیں چل پا رہے ہیں۔ ہماری بیٹی منظور کو اور منظور اسے چاہتا ہے۔ کیوں نہ دونوں کا رشتہ کر دیا جائے۔ جبکہ وہ کام کو سرانجام دینے کے لیے خود تیار ہو گئی تھی اور پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ یہ بات وہ منظور کے گھر والوں تک بھی پہونچا دے گی۔ ساجدہ کا باپ گو کہ پہلے اس معاملے میں سخت مخالف ہوا تھا۔ لیکن بالآخر جب اوروں کے کہنے سُننے کے علاوہ اُس نے اپنی بیٹی کا بھی وہی حال دیکھا اور اپنی آنکھوں سے اسے منظور سے باتیں کرتے دیکھا تو اس نے زہر کا یہ گھونٹ منہ میں انڈیل ہی لیا۔ اور بیوی کو اس بات کی اجازت دے دی کہ اس کا جو جی چاہے کر لے۔ اور اگر ہو سکے تو پر داداری سے کرے۔

اور بیوی کو حتمی اختیارات دینے کا یہی حاصل تھا کہ ساجدہ کی ماں نے بنا کسی روک ٹوک کے یہ بات آگے بڑھا دینے کی کوشش کی تھی۔ اُس نے جب یہ بات منظور کے گھر والوں سے کہی تو وہ ناراض نہیں ہوئے بلکہ خندہ پیشانی سے انھوں نے اس سے کہا کہ ہم پہلے منظور سے اس کی رائے پوچھ لیں۔ ساجدہ کی ماں نے شرم کو بالائے طاق رکھ کر یہ کہنے کی بھی کوشش کی تھی کہ دونوں آپس میں پیار کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ منظور سے اس کی رائے پوچھ کر کیا کریں گے ـــــ!! لیکن پھر بھی ایسے کاموں میں وقت لگتا ہی ہے۔ یہی سوچ کر انھوں نے فی الوقت کسی بات کی حامی نہیں بھری تھی اور نتیجتاً ساجدہ کی ماں کو صبر و تحمل سے کام لینا پڑا تھا۔

اُسے پھر بھی اس بات کا گماں تھا کہ بات پکی ہو کر ہی رہے گی۔ تبھی وہ خوش تھی۔ اُس کی خوشیاں اور اُس کے چہرے کی تازگی دیکھ کر ساجدہ بھی خوش تھی اور شمی بھی ـــــ اور بادلِ نخواستہ اُس کا خاوند بھی۔

شادی خانہ آبادی کی بات ابھی ابتدائی مرحلوں سے ہی گزر رہی تھی۔ کہ

منظور کا وطیرہ آہستہ آہستہ تبدیل ہونے لگا۔ جس دن اسے پہلی بار شکیلہ ملی تھی اسی دن ساجدہ کی ماں اس کے گھر گئی تھی۔ اسی لیے ساجدہ منظور کو وقتِ مقررہ پر نہ مل سکی تھی۔ وہ ملتی تو شاید شکیلہ منظور کے اتنے قریب نہ آئی ہوتی۔

شام کو منظور جب گھر پہنچا تو اس نے اپنے گھر والوں سے ساجدہ کی باتیں سُنیں اور گھر والوں نے کئی طریقوں سے اُسے آزمایا یہ جاننے کے لیے کہ واقعی کیا منظور ساجدہ کو پسند کرتا ہے۔ تو وہ بے رُخ ہو کر منہ نہ موڑتا بلکہ خوش ہو جاتا۔ خوشی سے پھولے نہ سماتا۔ مگر تقدیر کے آگے انسان کتنا بے بس ہے یہ آنے والا وقت ہی بتا دیتا ہے۔ اس نے گھر والوں کو قطعاً اس بات میں الجھنے نہ دیا کہ جو کچھ سچ ہے۔ جو کئی لوگوں سے اس کی بھابی، بہن اور بھائیوں نے سُنا تھا۔ جس کی تصدیق بھی ہوئی تھی وہ بات بالکل غلط ہے۔ ساجدہ کی بات سن کر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اس کے گھر والوں کو یہ رائے قائم کرنے میں دیر نہ لگی کہ ساجدہ کے تعیں اس کا رویہ دوسرا ہے۔ یہ خون کا رشتہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور بے چاری ساجدہ وقت کے ہاتھوں لُٹ گئی۔ تباہ و برباد ہو گئی۔ اس بیچاری کو لٹنا ہی تھا، برباد ہونا ہی تھا مگر کس مقام پر ــــ!! آج شاید اس کا دل اس چوٹ کو برداشت نہ کرتا۔

بہرصورت منظور اپنی نئی نویلی محبوبہ کو لیے اپنے کو وقف کیے ہوئے تھا۔ وہ روز ایک دوسرے سے ملتے، پہروں پیار کی باتیں کرتے، ہنستے کھیلتے رہے۔

بات آگے بڑھی اور ہر ایک نے ان کا افسانۂ عشق سُن لیا۔ جن لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال تھا کہ منظور ساجدہ کو سبز باغ دکھا چکا ہے۔ انھوں نے جب اُسے شکیلہ کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کی بات سنی، پہلے تو انھیں اس بات پر یقین ہی نہیں آیا لیکن جب یہ راز منصۂ شہود سے نکل کر سامنے آیا تو انھوں نے حقارت سے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ انہیں اس بات کی کوئی توقع نہ تھی کہ منظور ایسا گرا

ہوا کام کرسکتا ہے۔ اور جن لوگوں کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ کبھی ساجدہ سے بھی پیار کا ڈھونگ رچا چکا ہے وہ پھر بھی اس بات کو سُن کر بپھر گئے کہ شادی شدہ عورت کو پھنسانا کہاں کی عقل مندی ہے۔ بات تھی بھی عجیب سی۔

پہلے پہلے منظور نے بھی جب اس پر غور کیا تو اسے بھی یہ سب بڑا عجیب سا لگا۔ حتیٰ کہ کئی روز تک وہ گوشۂ تنہائی میں سوچتا رہا کہ کیا کیا جائے۔ ساجدہ پہلی لڑکی تھی جس کو اس نے پسند کیا تھا۔ وہ خوب صورت تھی، حسین تھی۔ اس کا شباب زوروں پر تھا۔ پھر ایک دم اس کے ذہن سے اس کا خیال کیوں اٹھ گیا۔ اس کا آخر قصور کیا تھا ــــ؟ کبھی کبھی ساجدہ کا تصور زبان پا کر اپنی بے بسی، بے کسی اور بے خطائی کا شکوہ اس طرح کرتا ع

دل نے چاہا تجھے خطا یہ ہے
اور میرا قصور کچھ بھی نہیں

صحیح معنوں میں اس کوئی قصور نہ تھا۔ قصور تو شکیلہ کا تھا جو کسی آسیبی خلل میں مبتلا تھی۔ اگر وہ کسی ذہنی پریشانی کا شکار نہ ہوتی تو شاید منظور کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کو بھی گناہ خیال کرتی اور اسے اپنے شادی شدہ ہونے کا احساس ہوتا۔

قصور وار تو منظور تھا جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ شکیلہ ایک شادی شدہ عورت ہے، اس کی طرف لپکا تھا۔ اور چونکہ ساجدہ بالکل بے قصور تھی، وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ حالات سے کس طرح نپٹا جائے۔

پہلے اسے یہ خیال آیا کہ وہ شکیلہ کے خیالوں کو یکسر بھلا دے۔ لیکن وہ جس حد تک اُس کے خیالات سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتا اس سے کئی زیادہ وہ گریبان پکڑے ہوئے نظر آتا۔

ساجدہ کا خیال ہی چھوڑتا تو اُسے خدا کے قہر و عتاب کا خوف کھایا کرتا۔

کیونکہ وہ خود ساجدہ کی طرف بڑھ چلا تھا۔ وہ اگرچہ خود بھی پیار کی پیاسی نظر آئی تھی لیکن پہل تو منظور ہی نے کی تھی۔ چنانچہ وہ اسی ذہنی کش مکش میں مبتلا تھا کہ کسی نے آکر یہ خبر کر دی کہ ساجدہ گاؤں کے ایک نوجوان راشد سے آنکھیں لڑاتی پھر رہی ہے۔ منظور کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ پہلے تو اُسے یقین ہی نہ آیا لیکن یہ بات توقع کے خلاف تھی لہٰذا اس نے بہت جلد اپنا اثر چھوڑا۔ چنانچہ تذبذب کے عالم میں پڑ کر اُس نے خبر لانے والے سے پوچھا۔

"حمید۔۔ا کہیں تم نے غلط تو نہیں سُنا ہے۔"

"کمال کی بات کر رہے ہو میاں" وہ نرالے ہی ڈھنگ سے سر کو جھٹکا دے کر بولا۔۔ "مَیں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔ اور تم کہہ رہے ہو کہ کہیں غلط تو نہیں سُنا۔۔۔ کیا بات ہے؟"

"تو کیا تم نے اپنی آنکھوں سے اُسے راشد سے ملتے دیکھا ہے۔۔۔؟" وہ پہلے کی طرح حیرت زدہ تھا۔

"جی ہاں، بالکل۔۔۔"

"کچھ باتیں بھی سُنی ہوں گی، جو اُن کے درمیان ہوئی ہوں گی، میرا مطلب ہے......"

"خدا جھوٹ نہ بلوائے۔۔" وہ اُس کی بات کاٹ کر بولا۔ "مَیں ان کے اتنے قریب نہ تھا کہ سرگوشیوں کو بھی سن سکتا، نہ میرے کان جاپان میڈ ہیں کہ سرگوشی کو آواز میں تبدیل کر سکیں۔"

"میرا مطلب ہے کہ یہ ضروری تو نہیں کہ اُن کے درمیان رازداری کی باتیں ہی ہوئی ہوں۔"

"ارے میاں کیا بات کرتے ہیں آپ بھی، عشق و محبت کی باتیں نہ کرتے تو

اتنی شام گئے ملنے کا کون سا فائدہ تھا، اور کیا مجبوری تھی۔ رسمی باتیں تو دن میں ہی ہوا کرتی ہیں۔ اور پھر بستی سے دور نکلنا کہاں کی دانشمندی ہے ــــ"

"تو کیا وہ بستی سے دور نکلے تھے ــــ؟" اس نے گھبراہٹ سی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ تو حمید نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ بولا۔

"ایک بار نہیں بلکہ کئی بار ایسا ہوا۔ جب دونوں بستی سے نکل کر باتیں کرتے ہوئے ملے۔ پہلے میں نے یہی سمجھا کہ کوئی گھریلو یا اسی قسم کی معمولی بات ہوگی لیکن جب ان کا ملنا ایک روایت سی بننے لگا تو میں محض دوستی کا حق ادا کرنے تمہارے پاس یہ خبر کرنے چلا آیا۔"

"خبر دینے کے لیے تمہارا شکریہ ــ!" وہ مردہ دلی سے بولا۔ "لیکن دکھ تو یہ ہے کہ ایک وہ ظالم مجھے دھوکہ دیتی رہی اور ایک میں ہوں کہ ابھی تک اس کی فکر میں مبتلا ہوں۔ کہ کہیں اس کے ساتھ دھوکہ نہ ہو جائے۔"

"بھول رہے ہو دوست!" حمید نے اس پر الٹا چوٹ کرنے کے لیے زبان کھولی۔ "یہ بھی خوب کہی کہ اس کے لیے فکر مند ہو، جبکہ ناطہ تم نے بھی اس کے بجائے شکیلہ سے جوڑا ہے۔"

"ابھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا۔" وہ حمید کی بات سن کر شرمندہ سا ہوا۔ اور اپنی خفت مٹانے کی غرض سے بولا۔ "ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ زندگی بھر کے لیے کس کا انتخاب کروں، شکیلہ کا یا ساجدہ کا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا سوجھی جو بیوفائی پر اتری۔"

"بیوفائی پر وہ نہیں تم اترے ہو ــ" حمید سادگی سے گویا ہوا۔ "ممکن ہے جس طرح تم نے اس کے دل کو شکیلہ سے مل کر ٹھیس پہنچائی اسی طرح وہ بھی راشد سے مل کر تمہیں دکھ پہنچانا چاہتی ہو ــ"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو ــــــ؟" منظور نے سوال کیا۔

"حالات دیکھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ اور پھر غلط بھی کیا ہے، اُسے حاصل کرنے کے لیے تمہیں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اور میں نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ تمہیں تمہارے گھر والوں نے بھی اس کا موقع دیا تھا۔ جو تم خود ٹال گئے ہو۔ اور بجائے اس کے کہ تم دل کی مراد بر آنے پر خدا کا شکر ادا کرتے تم نے ناحق ایک شادی شدہ عورت کو ورغلایا۔ جو کہ ایک گناہ بھی ہے۔ ایک ایسا گناہ جس کی تلافی کبھی نہ ہو گی۔"

منظور یہ سُن کر اور بھی شرمندہ ہوا۔ واقعی اس نے ایک بڑی غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ وہ یاس کی نظروں سے حمید کی طرف دیکھ کر چلا گیا۔ اور حمید کو ایسا لگا جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ اُس کے کندھوں سے اتر گیا ہو۔ وہ اسے نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتا رہا۔

ساجدہ پہلے تو یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھی کہ منظور کبھی خواب میں بھی شکیلہ کو اپنے اتنے قریب آنے دے گا۔ لیکن بعد ازاں وہ ان دونوں کو اس طرح کھوئے ہوئے دیکھ کر جس طرح کبھی منظور اس کے ساتھ کھویا کرتا تھا، اپنے بس میں نہ رہی۔ اس کا مدت ہوئے دیکھا ہوا بُرا خواب بُری تعبیر دکھا رہا تھا۔ وہ ہچکولے کھا رہی تھی۔ اس کی زندگی کا سفینہ اعتماد کے گرداب میں ڈوبنے کو تھا۔ اور وہ مدد کے لیے چلا رہی تھی، بلک بلک کر رو رہی تھی تڑپ تڑپ کر جان دے رہی تھی۔

اس نے کئی بار یہ کوشش کی کہ وہ منظور سے پوچھے کہ اس کا قصور کیا ہے۔ لیکن اب اس میں وہ کشش باقی نہ رہی تھی جو کسی زمانے میں منظور کو اپنی طرف کھینچ لائی تھی۔ کیا وہ محض اس لیے ٹھکرائی جا رہی ہے کہ وہ شکیلہ

کے مقابلے میں غریب ہے۔ لیکن دل کی بات دل میں ہی دفن ہو کے رہی اس میں اتنی بھی قوت باقی نہ تھی کہ منظور سے ایک دفع کہنے کی بھی جسارت کر سکتی۔

منظور نے جب سے اُس کی بیوفائی کی بات سنی تھی وہ آگ اگل رہا تھا۔ رہ رہ کے اُسے ساجدہ پر غصّہ آرہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ساجدہ کا گلا دبا دیتا۔ اور اُسے جان سے مار ڈالتا۔ لیکن شاید وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا، اور دوسری بات یہ تھی کہ وہ ایک بار خود یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جو کچھ حمید نے کہا ہے وہ سچ ہے بھی یا نہیں۔ حالانکہ اس سے پہلے اس کی نظر اپنی طرف اٹھنی چاہیئے تھی۔ اسے سوچنا یہ چاہیئے تھا کہ آخر بے وفا کون ہے؟ وہ خود یا ساجدہ۔

انسان کو اپنی بُرائی سے زیادہ دوسروں کی بُرائی نظر آتی ہے۔ اور دوسروں کی عیب جوئی کرنے سے اس کو ایک طرح کی تسکین ملتی ہے ایک قسم کا سکون ملتا ہے۔

منظور چونکہ اس انتظار میں تھا ہی کہ ایک بار وہ ساجدہ کو اپنی آنکھوں سے راشد کے ساتھ باتیں کرتا دیکھ لے۔ لہٰذا وہ ہر شام اور ہر صبح کو اُن دونوں کے تعاقب میں نکلتا۔ ایک روز وہ دکان سے واپس آرہا تھا، شام کا وقت تھا ہلکا ہلکا دھندلکا چھایا ہوا تھا کہ اس نے ساجدہ کو کسی سے باتیں کرتے ہوئے پکڑ ہی لیا۔ اُسے سُراغ مل گیا، وہ یہ جاننے کی کوشش بھی کرنے کے حق میں نہ تھا کہ اُس کے ساتھ باتیں کرنے والا راشد ہے یا کوئی اور۔

وہ خوش تھا، اس بات پر نہیں کہ اُس نے ساجدہ کی چوری پکڑ لی تھی بلکہ اس بات پر کہ اب اس کے لیے راستہ صاف تھا، وہ اب شکیلہ کے لیے زیادہ سے زیادہ سوچ سکتا تھا۔ ایک عرصے سے وہ اسی غم میں مبتلا تھا

کہ وہ ان دونوں میں سے کس کا انتخاب کرے۔ کس کو جیون ساتھی بنائے کبھی کبھی وہ یہ بھی پلان بنایا کرتا تھا کہ دونوں سے شادی کرے۔ اس راز کو وہ شکیلہ کے سامنے بھی کھول چکا تھا۔ اور اس نامراد نے اس بات کی حامی بھی بھر لی تھی کہ وہ ان دونوں کو اپنا لے۔ ہر چند کہ ایسے اقدام سے اس کا وقار مجروح ہو جاتا، سوسائٹی میں اس کی عزت نہ رہتی اور وہ ایک مدّت تک لوگوں کی صلوٰتوں کا شکار بنا رہتا۔ لہٰذا فی الوقت اس نے ایسا نہ کیا۔ اور اب جبکہ میدان صاف تھا، ساجدہ ہار مانتے ہوئے کسی اور پر ڈورے ڈالنے پر مجبور ہو چکی تھی اس لحاظ سے وہ مطمئن تھا۔ اس رات وہ خوشی کے مارے سو بھی نہ سکا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ رات بھر شکیلہ کے لیے تڑپتا رہا۔ اور جب صبح ہوئی تو وہ یہ خوش خبری سُنانے کے لیے اس کے پاس پہنچا اور ساری کہانی سنا کر اسے بھی حیرت میں ڈال دیا۔ پھر ایک زور دار قہقہہ دونوں کے حلق سے ابھر کر فضا میں ارتعاش پیدا کر گیا۔

"شکیلہ ــــ! اب تم میری ہو۔ اب راستہ صاف ہے کہ میں کھلے عام یہ دعویٰ کر سکوں کہ تم صرف میری ہو۔"

"مجھے اس بات کی انتہائی مسرت ہے کہ ساجدہ میری راہ سے خود بخود ہٹ گئی، جو میرے پیار کی راہ کا سب سے بڑا کانٹا تھی۔"

"خود بہ خود نہیں ہٹی، بلکہ اسے ہٹانے کے لیے مجھے تمہارا سہارا لینا پڑا۔ اور غریب نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔"

"خیر اسی بہانے ہمیں ایک دوسرے کے اتنے قریب آنے کا تو موقع مل گیا۔ نہ وہ راستے سے ہٹ جاتی اور نہ ہم ایک دوسرے کے اتنے قریب آجاتے۔"

"ہاں ــــ" منظور نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اب ہمیں کوئی ایسا قدم اٹھا ہی لینا چاہیئے تاکہ ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو کر رہیں اور پھر ساجدہ تو کیا دنیا ہمیں جدا نہ کر سکے۔"

"میں تمہارے ارادے کا خیر مقدم کرتی ہوں۔" شکیلہ نے بھی اسی انداز میں ویسی ہی خوشی کا اظہار کیا۔ "جو اب تمہارا دل چاہے کر لو، میں ہر طرح اور ہر حال میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اور عمر بھر تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔"

"مجھے تم سے ہمیشہ اسی بات کی توقع رہے گی شکیلہ!" منظور نے کہا اور شکیلہ بہت ہی آہستگی سے آ کر اس کے گلے لگ گئی۔ وہ دونوں دیر تک گلے لگے رہے۔ اور تب تھوڑی ہی دور پر کوئی تڑپ کر رو دیا۔

وہ الگ ہوئے تو سامنے ساجدہ حسرت بھری آنکھوں میں آنسو لیے ہوئے دونوں کی طرف باری باری سے دیکھ رہی تھی۔ منظور پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ اتنا شرمندہ ہوا گویا کسی نے اسے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو، اور حقیقتاً یہ کام بھی کسی چوری سے کم نہیں تھا۔ اگر موقع محل ہوتا تو وہ سر پٹ دوڑ کے بھاگ جاتا۔ لیکن وہ ایسا بھی نہ کر سکا اور سر جھکائے مجرم کی طرح کھڑا رہا۔ دوسری طرف شکیلہ خوش ہو رہی تھی کہ اس نے آخر کار ساجدہ کو منظور کے آگے نکمّا ثابت کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ وہ سر جھکائے ہوئے منظور کو بھی دیکھ رہی تھی۔ اور اسے بہت ناگوار گزرا تھا۔ اسی کشاکش میں ساجدہ تڑپ کر بولی۔

"مبارک ہو، تم دونوں کو پیار کا یہ سودا۔" وہ چند لمحوں تک وفورِ جذبات سے اس کے آگے کچھ نہ بول سکی۔ پھر ایک نئی طاقت کو پا کر اس

نے کہا۔
"میں تم دونوں کی راہ کا کانٹا تھی۔ ہٹ گئی، خود بخود ہٹ گئی۔"
پھر اس نے منظور پر وار کیا۔ "مجھے تمہارے پیار کا پہلے ہی سے علم ہوتا تو شاید میں تمہارے اتنے قریب نہ آتی کہ اب پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی میرے لیے مشکل ہو رہا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"ذلیل، کمینے تم آدمی کے بھیس میں شیطان ہو، اور اپنے اس شیطانی جال میں پھنساتے ہوئے تمہیں یہ بھی احساس نہیں ہوا کہ میں ایک عورت ہوں مجھ پر بدنامی کا وہ داغ لگ سکتا ہے کہ میں عمر بھر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہ سکوں گی۔"

"ساجدہ ____!" شکیلہ نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر گرجدار آواز میں پکارا۔ لیکن ساجدہ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اطمینان سے بولی ____

"ذلیل عورت! تم تو عورت ذات پر ایک بدنما دھبہ ہو، مجھے شرم آتی ہے تمہیں عورت کہتے ہوئے، بے شرم، بے غیرت، بے حیا کہیں کی، ارے تو نے تو دوستی کا بھی لحاظ نہیں کیا اور اپنی ہی سہیلی کو لوٹ لیا۔ برباد کر دیا اس کی محبت پر ڈاکہ ڈالا ہے تو نے۔ خدا کے قہر سے بھی نہ ڈری، شادی شدہ ہو کر تو نے ایسا قدم اٹھایا ____"

وہ اتنا ہی بول پائی تھی کہ منظور بول اٹھا۔ "کم ذات اوروں پر کیچڑ اچھالتے ہوئے تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ تم نے بھی کوئی جرم کیا ہوگا، کسی کے نازک احساسات کو مجروح کیا ہوگا۔ بیوفائی کی سب سے پہلے تو تم نے ہی اپنی بے وفائی کا ثبوت دیا ____"

ساجدہ کا رونا تیز ہوا۔ وہ بے خودسی ہو کر بولی۔ "اپنا گناہ چھپانے کے لیے تم نہ جانے مجھ پر کیا کیا تہمتیں ٹھہرادو گے ستم شعار، ظالم اور تنگ دل انسان۔"

"تہمت۔" وہ تعجب سے بولا۔ "ارے یہ بات بھی کوئی جھوٹ ہے کہ تم راشد سے نیا اقرار نامہ طے کر چکی ہو۔"

"راشد ــــــ" وہ سسک اٹھی۔ "راشد بھیّا کا نام لیتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیئے۔ وہ نہ کوئی ایسی نازیبا حرکت کر سکتا ہے اور نہ ہی تمہاری طرح گرا ہوا انسان ہے ...." وہ اس کے آگے بھی کچھ کہتی لیکن منظور کا ہاتھ اٹھا اور ایک زوردار چانٹا اس کے گال پر جا لگا۔ اس کا سارا وجود لرز کر رہ گیا، اور دوسرے ہی لمحے وہ روتے روتے وہاں سے چلی گئی۔

اس کے چلے جانے کے بعد منظور نے شکیلہ کے شانے تھپتھائے اور بنا کچھ کہتے ہوئے اپنی راہ ہو لیا۔ ساجدہ کو چانٹا مارنے کے بعد وہ اپنے اندر ایک درد سا محسوس کرنے لگا تھا۔ ایک ایسا درد جو ہر حال میں ناقابل برداشت تھا اور شکیلہ ناک سکوڑ کر رہ گئی۔ اُسے منظور کا اس طرح سے چلے جانا بہت بُرا لگا۔ اتنا بُرا کہ وہ ہونٹ چبا کر رہ گئی۔ اور جب منظور چلا گیا تو وہ ایک نیا منصوبہ دل ہی دل میں سوچنے لگی ــــ اُس کے چہرے پر اس وقت ایک اور شیطانی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جو بسا اوقات اس کے چہرے پر رینگتی رہتی تھی ــــ

دس

اگر دل کوئی ایسی چیز ہوتا جس کے ٹوٹنے کی آواز انسان سُن سکتا تو یقیناً منظور نے ساجدہ کے دل ٹوٹنے کی آواز سُنی ہوتی۔ لیکن چونکہ دل گوشت پوست کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے یہ ٹوٹ بھی جائے تو کسی کو خبر تک نہیں ہوتی لہذا ساجدہ زہر کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ اس پر ایک جنون سا طاری تھا۔ وہ دیوانی کی طرح اپنی اُسی جگہ پر آگئی تھی جہاں پر وہ منظور کے ملنے سے پہلے تھی۔ کبھی کبھی وہ یہ بھی سوچ کر رہ جاتی کہ شاید تڑپنا اس کی قسمت میں ہی لکھا ہے۔ اپنی بدنصیبی پر وہ بہت روئی، بہت پچھتائی، بہت آنسو بہائے۔ لیکن آنسوؤں کی ہستی ہی کیا جب سامنے غم کا پہاڑ ہو۔۔۔۔ کسی کے رونے سے پہاڑ تو نہیں گرتے۔

دوسری طرف منظور بھی پشیمان ہو گیا تھا۔ ناحق اس نے ساجدہ کے گال پر چانٹا مارا تھا۔ ساجدہ بے قصور تھی۔ اس رات وہ بہت رویا تھا۔ اتنا رویا تھا کہ صبح کو اس کی طبیعت بوجھل تھی، سر میں ہلکا سا درد تھا، جسم کا انگ انگ بخار سے جل رہا تھا۔ اسے رہ رہ کے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید اس بات کا اُسے زیادہ رنج تھا کہ اس نے آج تک شکیلہ کے بارے میں کبھی سنجیدگی سے سوچا نہ تھا جو ایک شادی شدہ عورت تھی۔ اگر وہ اپنے گھر میں اس کے ساتھ شادی

کرنے کی بات چھیڑ دیتا تو اس کے گھر والے کیا سوچتے، کیا کہتے؟۔

ایک ایسی عورت کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش رکھنا جو پہلے سے ہی شادی شدہ ہو شرم کی بات ہے۔ ہمارا معاشرہ اس کی قطعاً کوئی اجازت نہیں دیتا۔ ہاں اگر وہ بیوہ ہوتی یعنی اس کا شوہر مر چکا ہوتا تو شاید یہ کارِ ثواب مانا جاتا۔ وہ بہت سنجیدگی سے اس بارے میں سوچنے لگا۔ ساجدہ کی باتوں میں کتنی سچّائی تھی۔

"ذلیل عورت! تم تو عورت ذات پر دھبہ ہو، تمہیں عورت کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے، بے شرم، بے غیرت۔ تو نے اپنی سہیلی تک کو لوٹ لیا، برباد کر دیا۔ کسی کی محبت پر اپنا حق جتایا۔ خدا کے قہر سے بھی نہ ڈری کہ شادی شدہ ہو کر بھی تو نے ایسا قدم اٹھایا"۔

واقعی شکیلہ کو ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا۔ شادی کے بعد کسی غیر مرد کو چاہنا کسی عورت کو زیب نہیں دیتا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا اور اس کے سر کا درد زیادہ بڑھ رہا تھا۔ اس کے جسم کا ہر ایک حصّہ دکھ رہا تھا۔ اسے اپنی غلطی کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ وہ جس قدر اپنی غلطی پر غور کر رہا تھا، اس سے کہیں زیادہ سر درد اپنا کام کر رہا تھا۔ شام تک وہ اپنے حاضر و غائب سے بے خبر ہو چکا تھا۔ بخار نے اس قدر شدّت اختیار کر لی تھی کہ وہ بستر پر ہی چپک گیا تھا۔ اُس کی ٹانگوں میں اتنی بھی جان نہیں تھی کہ وہ بستر چھوڑ دیتا اور جیسا کہ اس کا دل چاہتا تھا، ساجدہ سے اپنے کیے کی معافی مانگ لیتا۔

رات بھر وہ انگاروں پر لوٹتا رہا۔ یہ رات، رات نہیں تھی بلکہ ایک ناگن تھی جو تمام رات اس کی رگ رگ میں زہر گھولتی رہی۔ صبح کو طبیعت کچھ ہلکی سی تھی وہ اپنی پہلی فرصت میں کوئی ایسا قدم اٹھانا چاہتا تھا تاکہ ساجدہ اُسے معاف کر دے۔

وہ خیالات میں گھومتا ہوا چل رہا تھا۔ معلوم نہ تھا کہ قدم کہاں جانا چاہتے ہیں کس سے ملنے کے لیے اٹھ رہے ہیں کہ کوئی اسی سے ٹکراتے بچ گیا۔ وہ ہوش میں آیا تو سامنے راشد کو پایا۔ ایک بے وقت ناراضگی اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ ایک طرف اگر شکیلہ نے اُسے ساجدہ سے دور کیا تھا تو دوسری طرف راشد نے بھی ساجدہ کو اس سے دور کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ پہلے اس کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھتا رہا پھر کسی حد تک اپنے کو قابو میں کرتے ہوئے بولا۔

"راشد! میں نے تمہیں کون سی اذیت پہنچائی تھی، میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم نے مجھ سے میرا صبر و قرار چھین لیا، یہ کس دشمنی کا بدلہ لے رہے ہو تم؟"

"میں سمجھا نہیں۔۔۔" اُس نے حیرانگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

منظور پہلے سے زیادہ قہر آلود نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ راشد کے اس 'سمجھا نہیں' نے اسے اور بھی جلا دیا۔ وہ بولا۔۔۔ "اچھی طرح سے سمجھ رہے ہو کہ میرا اشارہ کس طرف ہے اور پھر بھی بننے کی کوشش کر رہے ہو۔۔۔"

"واللہ بات میرے پلّے نہیں پڑی۔" وہ نہایت سادگی سے بولا۔ "کم سے کم سلیس تو کیجئے اور صاف الفاظ میں کہیئے جو کچھ کہنا چاہتے ہو۔۔۔"

اِس بار منظور نے بھی اپنا لہجہ نرم کر دیا۔ بولا۔

"ساجدہ کے ساتھ عشق ہی کرنا تھا تو کسی سے پوچھ کر کرتے کہ کہیں وہ پہلے ہی سے مرضِ عشق میں مبتلا تو نہیں ہے، یا کسی کو اپنا ہم سفر تو تسلیم نہیں کر چکی ہے۔"

"جب اس کے ہم سفر ہی منہ موڑ چکے تھے تو میں نے راستہ ہموار دیکھ کر بسم اللہ کی، ورنہ کون نامراد دل میں ایسی ٹھان لیتا۔۔۔" وہ سادگی سے بولا۔

"ہم سفر کب منہ موڑ چکے تھے، یہ تم سے کس نے کہا؟"

"مجھ سے کون کہتا، یہ تم مجھ سے ہی پوچھنا چاہتے ہو۔"

"ہاں تمہارے سوا بتا ہی کون سکتا ہے ۔۔۔" منظور نے نہایت ہی اداس لہجے میں کہا۔ اور راشد زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا ۔۔۔ "میرے دوست تم چاہتے تو اپنی نئی محبوبہ سے بھی تمہیں اس کا جواب مل جاتا۔ میں کہوں تو تم شاید اُسے سچ تسلیم نہ کرو ۔"

"مجھے بتاؤ راشد ۔۔۔!" اُس کی آواز گلوگیر تھی۔ "اپنی حالت آج کل بالکل غیر ہے۔ اگر تم خود اس کی طرف بڑھے ہو تو مجھے تم پر غصہ بھی آسکتا ہے، اور اگر ساجدہ ہی تمہاری طرف بڑھی ہے تو وہ کس مجبوری کے تحت ۔۔۔؟"

"یہ ایک درد بھری کہانی ہے میرے بھائی! شاید تم سن کر یقین نہ کرو، اور اگر تم یقین کر بھی لو تو اس سے ہو گا کیا۔ تیر تو کمان سے نکل چکا ہے نا ۔۔۔"

"پھوٹ پڑو راشد! پھوٹ پڑو، میرے ضبط کا پیالہ لبریز ہو چکا ہے، میرے صبر و تحمل کا اور امتحان نہ لو، خدا کے لیے بتاؤ بھی اب ۔۔۔"

"تو سنو ۔۔۔" راشد نے کہنا شروع کر دیا۔ "لیکن مجھے یقین ہے کہ تم سن کر نہ صرف شکیلہ سے بلکہ مجھ سے بھی نفرت کرنے لگو گے ۔۔۔" وہ ایک آہ چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا ۔۔۔ "ایک شام کو جب تین ساہوکار اکٹھے مل کر مجھ سے قرض مانگنے آئے اور میں نے چچا سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ بجائے اس کے کہ میری مدد کریں مجھ پر الٹا برس پڑے اور مجھے مایوس کر دیا۔ یہ بات کہیں شکیلہ نے بھی سُن لی تھی۔ بڑی مشکل سے جب میں اُن لوگوں سے اس روز چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو گیا تو اسی شام کو مجھے شکیلہ نے بلوایا۔ میں کسی اور ہی نیت سے وہاں گیا تھا۔ لیکن وہاں کچھ اور ہی رنگ دیکھا۔ شکیلہ مجھے دیکھتے ہی بول پڑی ۔۔۔

"کتنا روپیہ چاہیئے تمہیں؟"

اِس غیر متوقع سوال پر میں چونک پڑا۔ اور اس کی طرف ایسے دیکھنے لگا جیسے

کُتّا اپنے مالک کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھتا ہے۔

"کیا تم دے سکو گی ——؟" میں نے اُلٹا سوال کر دیا۔

"ہاں —— میں دے دوں گی تمہیں، بتاؤ کتنا چاہیئے؟" اس نے قریب ہی رکھا ہوا پرس کھولا اور نوٹ گِننے لگی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "مگر تم میری مدد کیوں کرنا چاہتی ہو؟ شاید بعد میں تمہارا قرض نہ چکا سکوں۔"

"چکانے کے لیے میں کب دے رہی ہوں۔" وہ سادگی سے بولی تو میری حیرت کا ٹھکانا نہ رہا۔

"تو پھر کیوں دے رہی ہو ——؟"

"دیکھو راشد! " اس نے اب مخصوص انداز اختیار کیا۔ "میں نے سنا ہے اور یہ سچ بھی ہے کہ داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ کو دھوتا ہے اور بایاں ہاتھ دائیں ہاتھ کو —— تمہیں صرف میرے لیے ایک کام کرنا ہوگا، ایک معمولی سا کام۔"

"ایک معمولی سا کام کرنا ہے اور تم اس کے لیے مجھے اتنی بڑی رقم دینے پر تُلی ہوئی ہو۔ اگر کام اتنا ہی معمولی ہے تو تم خود کیوں نہیں کر لیتیں ——؟"

"یہی تو مصیبت ہے کہ میں خود نہیں کر سکتی اور تمہاری مدد کی ضرورت پڑ رہی ہے۔"

"اچھا کام بتاؤ ——" میں سادگی سے بولا۔ حالانکہ وہ روپئے دیکھ کر مجھے خدشہ ہو رہا تھا کہ شاید کسی کو موت کے گھاٹ اتارنا ہوگا، یا پھر کسی کو لوٹنا ہوگا۔ چنانچہ وہ بولی۔

"ساجدہ کو جانتے ہو ——؟ میرا مطلب ہے کریم والی ساجدہ۔"

"ہاں —— کیوں ——؟"

"وہ اسی محلّے کے ایک لڑکے منظور، میرا مطلب ہے دکاندار منظور سے عشق فرما رہی ہے، اس کو تمہیں راستے سے ہٹانا ہوگا۔ اس طرح کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"ساجدہ منظور کا قصّہ تو محلّے میں بہت پرانا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں اور ممکن ہے اُن کی شادی بھی جلدی ہی ہو جائے۔ پھر ان کو ایک دوسرے سے جدا کر کے تمہیں کیا ملے گا ___؟" میری حیرت کی حد ہی نہ رہی تھی۔

"مجھے کیا ملے گا، کیا نہیں، اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہیئے، تم تو 'ہاں' یا 'نا' میں جواب دو، بولو یہ کام کرو گے یا نہیں۔ بعد میں نہ کہنا کہ اتنے ڈھیر سارے روپئے گنوا دیئے۔"

روپئے دیکھ کر میرا ایمان بدلا تھا لیکن میں کئی روز تک اُسے دھوکا دیتا رہا، کہ آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں۔ حقیقت اس کے بعید تھی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا تم بھی ساجدہ کو چھوڑنے کے درپے ہو یا نہیں۔ اور اس سوال کا جواب مجھے دونوں کے ایک دوسرے کے ساتھ پیار بانٹنے سے ملا۔ میں نے ساجدہ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ جسے وہ پیار کی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور اس کی ہر دعا میں جس منظور کا نام تھا وہ دغاباز نکلا۔ اس نے وعدہ وفا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ خدا گواہ اِس کے سوا غریب ساجدہ سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ تو مجھے اپنے بھائی کا درجہ دیتی ہے۔ اور میں کتنا بدنصیب ہوں جو اپنی ہی بہن کے خوابوں کو چند روپیوں کے عوض بیچ ڈالا___ وہ کہتے کہتے تڑپ کر رو پڑا۔ اور اس حقیقت سے منظور بھی منہ نہ موڑ سکتا تھا کہ جو کچھ اس سے سرزد ہوا وہ بھی ٹھیک نہ تھا۔ وہ خود بھی قصوروار تھا۔ دو موٹے آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں سے بھی چھلک کر گر پڑے۔ اپنی حالت پر اُسے خود ہی ترس آ رہا تھا آج اس نے ایک ایسے راز کو فاش ہوتے ہوئے دیکھا تھا جس میں وہ سب ملوث تھے۔ شکیلہ بھی، راشد بھی اور وہ خود بھی۔ اس راز کا بھرم رکھنے سے بے چاری ساجدہ داؤ پر لگ گئی تھی۔

بہت دیر تک خاموشی کے آنسو بہانے اور پچھتانے کے بعد منظور نے زبان

کھولی۔

"میں اپنے گناہوں سے نجات پانا چاہتا ہوں راشد! کیا تم مجھے ساجدہ کے پاس لے جا سکتے ہو۔۔۔؟"

"میں ضرور لے جا سکتا ہوں، لیکن فائدہ کیا ہے؟"

"میں اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ اسی صورت میں میرے دل کو تسکین مل سکتی ہے۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔"

"تم میری بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے ہو منظور! گناہوں سے نجات پانے اور معافی مانگنے سے اب ہو بھی کیا سکتا ہے۔ اب تو وہ تم سے شاید ہی ملنا پسند کرے گی۔"

"مگر کیوں۔۔۔؟" وہ امید و بیم کی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا "کیا میں اس قابل بھی نہیں۔۔۔؟"

"ایسی بات نہیں ہے۔۔۔" راشد، منظور کی بات کاٹتے ہوئے بولا "بات یہ ہے کہ اب ساجدہ کی شادی طے ہو چکی ہے۔ اس کے گھر والے شاید ہی اسے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دیں۔"

"اُس کی شادی طے ہو گئی ہے؟" ایک دم آسمان اس پر ٹوٹ پڑا "کیا کہتے ہو راشد! ایسا کب ہوا؟"

"جب تقدیر کو منظور تھا۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔ اور منظور کو پرانا واقعہ یاد آ گیا۔ ساجدہ نے ایک بار کہا تھا۔

"میں تقدیر کی بات کر رہی ہوں جس کے آگے کبھی کبھی انسان بے بس ہو جاتا ہے۔۔۔"

"تقدیر کو بدلنا ہو گا ساجدہ۔۔۔!" وہ ایک عزم کے ساتھ بولا تھا "اگر اُس

نے بھی تمہیں مجھ سے جُدا کرنے کی کوشش کی تو میں ساری دنیا کو آگ لگا دوں گا۔"

"تمہارے آگ لگانے سے بھی کیا ہوگا، وہی نا جو خدا کو منظور ہے۔"

"نہیں جو منظورؔ کو منظور ہوگا وہی ہو کر رہے گا۔ مجھے پوری امید ہے۔"

"تو کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ منظورؔ کو کیا منظور ہے؟" وہ دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھ بیٹھی تھی۔

"یہی کہ تم عمر بھر کے لیے میری ہو جاؤ اور بس، دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے مجھے اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔"

مگر اس سے پہلے ہی وہ اپنے عزم سے پیچھے ہٹا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ ساجدہ کو ہار چکا تھا۔ وہ ان خیالات سے لوٹ آیا تو اس کی آنکھوں نے راشد کو ٹٹولا مگر وہ نہ جانے کب کا جا چکا تھا۔ اپنے ماتھے پر پچھتاوے کا ہاتھ مار کر وہ بھی لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے واپس لوٹ آیا۔ قدم کہیں، نظر کہیں، دل کہیں اور خود حال سے بے حال۔ اس کے جسم کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ بج رہا تھا درد کی شدّت سے۔ اس سے اپنا راستہ بھی نہیں دیکھا جا رہا تھا دنیا اس کی نظروں میں تاریک ہو چکی تھی۔ اس وقت اس کی حالت ایک ایسے مسافر کی سی تھی راستے میں جس کا سب کچھ لٹ گیا ہو، اور منزل بھی ہاتھ نہ آئی ہو۔ دور بہت دور سے کسی کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی ؎

اے غم یار بتا کیسے جیا کرتے ہیں
جن کی تقدیر بگڑ جاتی ہے کیا کرتے ہیں

یہ بات کُھل کر سامنے آ گئی تھی کہ ساجدہ اصل میں بے قصور ہے۔ ہاں ایک بات جو ابھی تک منظورؔ کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی وہ یہ تھی کہ اس نے خود بھی ایک بار ساجدہ کو شام کی سیاہی میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ کون تھا؟ اور ساجدہ کے ساتھ کیا باتیں کر رہا تھا؟ پہلے تو اس کا شک تھا کہ وہ راشد ہی تھا۔ لیکن

چونکہ راشدہ نے اپنی صفائی پیش کر دی تھی اور اس بات کا ذکر نہیں آیا تھا۔ لہٰذا وہ اس کھوج میں تھا کہ صحیح بات کا پتہ چل جائے اور وہ اپنے من کو صاف کر سکے۔ حالانکہ اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہ تھا۔ کیونکہ ساجدہ کے گھر والوں نے اس کی جوانی کو یوں ضائع ہوتے دیکھ کر اور لوگوں کے طعنوں سے بچنے کے لیے ایک غریب اور اپنے جیسے گھر میں اس کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ نہ جانے کیوں اپنے دل میں ساجدہ کے اسی تقدس کو جگہ دینا چاہتا تھا۔ یہ جاننے سے وہ خود بھی قاصر تھا۔

کئی دنوں تک وہ کھویا کھویا رہا، خود ہی میں یا کمرے کی چار دیواری تک۔ اپنی بیوفائی پر وہ بہت رویا تھا۔ اتنا کہ اب آنکھوں میں وہ آنسو بھی نہ تھے کہ کسی کے لیے پانی کی طرح بہا دیتا۔ اب وہ رات گئے تک گھر سے باہر رہتا۔ دل بے قرار تھا ہی، نگاہوں میں ایک نیا اضطراب پیدا ہو چکا تھا۔

اضطراب اور مایوسی کے اس عالم میں اس کا وہ شکوہ بھی دور ہو گیا تھا جب حمیدؔ نے اسے بتا دیا کہ اُس شام ساجدہ میرے ساتھ ہی باتیں کر رہی تھی۔ وہ اُس دن منظورؔ سے یہ پوچھنے آئی تھی کہ وہ بے وفائی کرنے پر کیوں اتر آیا ہے۔ لیکن حمیدؔ نے اُسے ایسا نہ کرنے دیا تھا۔ اُس نے ساجدہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ منظورؔ کو اس سے ضرور ملائے گا۔ اور پھر دونوں کو دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔

لیکن اب تو وہ وقت گزر چکا تھا۔ نہ اب کوئی ساجدہ پیار کی پیاسی رہ گئی تھی اور نہ کوئی چاہنے والا منظور ہی باقی تھا۔ زمانہ کروٹ بدل چکا تھا اور اُس کی کروٹ کے نیچے بہت سے دور دب چکے تھے۔

منظورؔ اب ہارے ہوئے جواری کی طرح تھا۔ اُس نے اگرچہ جُوا زندگی میں کبھی نہ کھیلا تھا لیکن پیار کی بازی ہار کر ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس نے اپنا سب کچھ جُوئے میں ہار دیا ہو۔ اور اس کی ذمہ داری شکیلہ کے سر تھی۔ منظورؔ نہ چاہتے ہوئے بھی

اس سے ایک بار ملنا چاہتا تھا۔ تاکہ اس پر حقارت سے تھوکے اور اسے ایک بار پھر یاد دلائے کہ وہ صحیح معنوں میں عورت نہیں ہے بلکہ عورت ذات پر ایک بدنما داغ ہے۔
وہ اس ارادے سے وہاں گیا بھی۔ اور دروازے پر اسے خلافِ توقع حمید ملا۔ جس کے چہرے پر غم و غصے کے ہزاروں سائے منڈلا رہے تھے۔ وہ منظور کو دیکھتے ہی چلاّیا "غلط جگہ پر آئے ہو دوست! یہاں تمہاری محبوبہ کا کوئی سُراغ نہیں ملتا۔ ہاں اتنا پتہ معلوم ہو سکا ہے کہ یہاں شکیلہ نام کی کوئی شادی شدہ عورت رہا کرتی تھی۔ جو کل شام ہی اپنی سسرال چلی گئی ہے۔"
"حرام زادی ــــــ چلی گئی ہے۔" منظور دانت پیس کر رہ گیا۔ "چلو اچھا ہوا منہ سلامت رہا۔ ورنہ کئی ہزار گالیوں سے نوازتا اُسے۔" اور اتنا کہہ کر وہ اُلٹے پاؤں واپس آ گیا غیض و غضب کا مارا۔ غصّے سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

گیارہ

کئی مہینوں تک منظور ذہنی طور پر بیمار رہا۔ اس دوران اس نے ساجدہ سے ملنے اور اپنے کئے کی معافی مانگنے کی بھی بہت کوشش کی لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس میں اسے دو دشواریاں پیش آرہی تھیں ایک تو یہ کہ ساجدہ اب گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی، اور دوسری یہ کہ اب خود اس میں اتنی ہمّت باقی نہیں تھی کہ وہ ساجدہ کا سامنا کر سکتا۔

اس نے ایک ناقابلِ تلافی غلطی کی تھی جس کا خمیازہ وہ آج تک بھگت رہا تھا اور شاید یہ عمر بھر بھگتنے کی سزا تھی جسے وہ رو رو کے کاٹ رہا تھا۔ لوگوں کی نظروں میں وہ اپنا اصلی مقام کسی حد تک پھر سے بنانے میں کامیاب ضرور ہوا تھا۔ لیکن خود اس کا دل اداس رہتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کا ذلیل ترین انسان تصور کرتا تھا۔ اور اندر کی یہ خلش اسے مارے ڈال رہی تھی۔ اندر ہی اندر اسے کھوکھلا کئے دے رہی تھی۔

آدمی سے کوئی بُری حرکت سرزد ہو جائے اور اگر وہ دوسروں کی نظروں سے بچ بھی جائے مگر اپنی نظروں میں گر ضرور جاتا ہے۔ وہ اپنی صحیح قیمت کھو دیتا ہے۔ اور ظاہر ہے جب وہ اپنی ہی نظروں میں گر جائے تو وہ ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر اسے معلوم نہیں رہتا کہ وہ کیا سوچتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ جو کچھ وہ کرتا ہے وہ موزوں بھی ہے یا نہیں، اسے کچھ خبر نہیں رہتی۔

منظور بھی ذہنی طور پر اپنے آپ کو بیمار محسوس کر رہا تھا۔ اس کے دل کو کسی ایسی

چیز کی تلاش تھی تاکہ وہ سکون و اطمینان سے رہ سکتا۔ تبھی تو وہ ہر چیز کی طرف پہروں دیکھتا رہتا اور اپنی نگاہوں کا زاویہ اس وقت تک نہ بدلتا جب تک وہ تھک نہ جاتا کسی جوان لڑکی کو دیکھتا تو ساجدہ کا پیار یاد آجاتا اور پھر اپنی بیوفائی کی طرف اس کی نظر اٹھ جاتی تو آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور دل سے ایک آہ چھوٹ پڑتی اور دنیا اس کی نظروں میں تاریک ہو جاتی۔ اور وہ گھبرا کر چلّا اٹھتا___ساجدہ.....!!

اس درد کا پہلا اور آخری مُداوا ساجدہ ہی تھی جسے ٹھکرا کر وہ کڑی آزمائشوں سے گزر رہا تھا۔ درد و غم کا یہ بھیانک طوفان اسے بہائے چلا جا رہا تھا، وہ سب کچھ پیچھے چھوڑ کر بہا چلا جا رہا تھا۔ اس کی زندگی تیز و تند لہروں پر ہچکولے کھا رہی تھی۔ یہی ہچکولے کھاتے کھاتے اُسے ایک دن ایک ایسی دوشیزہ ملی جو اسی کی طرح دنیا سے بے نیاز نظر آ رہی تھی۔ چنانچہ یادیں ختم اور باتیں شروع ہو گئیں۔

"اس دنیا میں ایک میں ہوں جو زمانے کی ستائی اور ٹھکرائی ہوئی ہوں، اور شاید کوئی نہیں ہے۔"

"ایک تم ہی کیا شائستہ! ہزاروں ہوں گے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ یہ دنیا ایک غم کدہ ہے ایک ایسی قید ہے جس میں زندگی پانے کی پاداش میں ہر ایک کو کسی نہ کسی قسم کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔" منظور جو شائستہ کے ساتھ بس میں سفر کر رہا تھا۔ اور چونکہ اُن دونوں میں پہلے ہی سے جان پہچان تھی پھر جب سفر میں قرب حاصل ہوا تو اِدھر اُدھر کی باتوں کے ساتھ حدیثِ دلبراں تک آ گئے۔

"تو کیا آپ بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہیں کہ یہ دنیا ایک غم کدہ ہے، ایک قید خانہ ہے۔" شائستہ اُسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"محسوس کرنا تو کیا___" منظور ایک آہِ سرد بھر کر بولا۔ "یوں سمجھو کہ ان انسانوں کی ایک زندہ تصویر تمہارے سامنے ہے۔"

"کیا کہتے ہیں آپ — !" وہ حیرت میں پڑ گئی اور بھری بھری آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ "کیا آپ بھی......؟"

"ہاں — !" منظور نے اُس کی بات کو آگے لے جاتے ہوئے کہا۔ "میں بھی زمانے کا ٹھکرایا اور ستایا ہوا انسان ہوں۔"

شائستہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔ بس اپنی رفتار سے آگے جا رہی تھی۔ اُن دونوں کی زندگی کی طرح ہچکولے کھاتی ہوئی۔ وہ دونوں بھی سوچ کے جنگل میں بھٹکنے لگے تھے۔

"آپ اپنی زندگی کو کسی دوسرے موڑ کی طرف کیوں نہیں لے گئے؟ ممکن تھا کہ سارے غم دور ہو جاتے۔"

"اور اگر یہی سوال میں تم سے کروں تو تم کیا جواب دو گی —؟" منظور نے اُلٹا سوال کر دیا تو وہ سر جھکا کر بولی۔

"میری بات اور ہے میں تو ایک لڑکی ہوں، اور لڑکی بے بس و مجبور ہوتی ہے۔ اُسے پھونک پھونک کر قدم رکھنے پڑتے ہیں۔ اِس صورتِ حال کو مدِّنظر رکھ کر میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔ مگر آپ تو مرد ہیں، آپ کے ساتھ تو ایسی کوئی مجبوری بھی جُڑی ہوئی نہیں پھر بھی —؟"

"پھر بھی میں خود کو بے بس کیوں تصوّر کرتا ہوں — یہی پوچھنا چاہتی ہو نا —؟" اُس نے کاٹ کر بات کی تو شائستہ نے سر ہلا کر 'ہاں' کہہ دی۔ وہ ایک اور آہ بھر کر رہ گیا پھر اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ یہ شعر آ گیا ؎

منزلیں اپنی جگہ ہیں راستے اپنی جگہ
جب قدم ہی ساتھ نا دیں تو مسافر کیا کرے

"ہاں۔ اِشاعر نے بہت خوب کہا ہے۔" شائستہ دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔ "جب

انسان کا مقدر بگڑ جاتا ہے تو اس کے آگے انسان کی ایک بھی نہیں چلتی۔"

"شائستہ ۔۔۔!!" منظور نے ایک نئے ہی ارادے، نئے ہی عزم کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ "پہلی مرتبہ زندگی میں مجھے تمہاری شکل کا ہم سفر مل گیا۔ کیا تم بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی ہو ؟"

"یقیناً ۔۔۔۔۔! مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔"

"تو کیوں نہ ایسا کریں ۔۔۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اور بات کو آگے بڑھانے کے لیے اُسے الفاظ کی کمی محسوس ہونے لگی۔ وہ یہ بھی سوچ کر رہ گیا کہ کہنا مناسب بھی ہے یا نہیں۔ اُسی لمحہ شائستہ بول اٹھی۔

"رک کیوں گئے۔؟ کہیئے نا۔۔۔"

شائستہ کی اِس بات نے اُس کی ہمت بڑھائی اور وہ بے جھجک بول پڑا۔

"کیوں نہ ہم ایک ہی راستہ اختیار کریں۔۔۔۔؟ تمہارا کیا خیال ہے ؟"

شائستہ چند لمحوں تک گونگی بنی بیٹھی رہی اور کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس دوران منظور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ بالآخر اُس نے بھی ایک لمبی سرد آہ بھری اور بولی۔

"خیال تو اچھا ہے اور شاید نیک بھی لیکن میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ میں ایک لڑکی ہوں، ایک بے بس اور مجبور لڑکی۔ مجھے پھونک پھونک کر زمین پر قدم رکھنے پڑ رہے ہیں۔ اِس صورتِ حال کو مدّ نظر رکھتے ہوئے مجھے سوچنے میں وقت ضرور لگے گا۔"

"تو سوچ لو، اور سوچ سمجھ کر مجھے اپنی رائے سے آگاہ کر دیجئے گا۔ مَیں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے، میں تمہیں اس بارے میں جلدی ہی آگاہ کر دوں گی تب تک خدا سے تمہارے واسطے نیک دعاؤں کے دفتر کھول کے رکھ دوں گی۔۔۔"

"شکریہ ــــ !! آپ کے اس کرم کے بدلے میں اور کیا کہوں ــــ" منظور کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی اور دوسرے ہی لمحہ وہ اپنی منزل تک پہونچ گئے تھے۔ بس کنڈیکٹر انہیں اپنی منزل پر پہونچنے کی خبر کر چکا تھا۔ بس سے اترنے کے بعد منظور نے شائستہ کی طرف اور شائستہ نے منظور کی طرف الوداعی نظروں سے دیکھا اور پھر دو مسافر دو الگ الگ راستوں پر روانہ ہو گئے۔

منظور اب بظاہر پہلے سے خوش نظر آ رہا تھا۔ اُس کے نصف غم شائستہ کے حسین خیالوں میں مُدغم ہو گئے تھے۔ وہ اپنے اندر ایک انجانی سی مسرت محسوس کر رہا تھا۔ اُسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ شائستہ اپنا فیصلہ اسی کے حق میں دے گی۔ کئی روز تک وہ اُس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ شائستہ ملے تو دونوں بیٹھ کر باتیں کریں اور ایک دوسرے کے مَن کا بوجھ ہلکا ہو۔ اور پھر دونوں کے لیے زندگی کی نئی راہیں کھلیں۔

اس طرح ایک مہینہ یادوں ہی یادوں میں گزرا۔ خیالات کے ہجوم میں منظور ایسا گھِرا تھا کہ نکل ہی نہ پاتا تھا۔ اور وہ چاہتا بھی یہی تھا کہ کسی کی یادوں میں کھویا رہے تاکہ پُرانے غم حملہ نہ کریں۔ وہ اپنی جگہ مطمئن اور پُر امید تھا کہ شائستہ اُسی کی ہے۔ صرف اُسی کی ساجدہ اور شکیلہ کو کھونے کے بعد اُسے وہ ملی تھی۔ اور بڑی مشکل سے ملی تھی۔ منظور اُسے کھو کر اپنے آپ کو حرماں نصیبی کا شکار نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔

آخر منظور کے اعتماد کی سچّائی رنگ لائی اور دوسرے مہینے کے پہلے ہفتے میں ایک لڑکا قاصد بن کر منظور کے پاس آیا۔ اُس نے ایک چھوٹا مگر خوب صورت سا لفافہ منظور کو دیا۔ منظور نے تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ لفافہ چاک کیا اور پرچہ نکال کر بڑی بے صبری کے ساتھ پڑھنا شروع کیا ــــ لکھا تھا۔

ڈیئر منظور ! تسلیمات !

مَیں نے نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ کچھ بھی ہو،

کوئی بھی مجبوری پیش آئے میں آپ کو صدقِ دل سے اپنا ہم سفر تسلیم کرتی ہوں۔ اور دعا کرتی ہوں کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوں۔ آمین۔

میں ایک مجبوری کے سبب آپ سے خود نہیں مل سکی اس کے لیے معذرت چاہتی ہوں، ہاں ایک ضروری بات یہ ہے کہ مجھے اِن دِنوں کچھ روپیوں کی ضرورت پڑ گئی ہے اگر آپ دے سکیں تو نہایت ہی ممنون رہوں گی۔

آپ ہی کی

شائستہ

خط کی عبارت کئی بار منظور نے پڑھی۔ بار بار پڑھ کر بھی اس کے دل کو تسلّی نہیں ہو پا رہی تھی۔ ہوش میں آکر اُس نے قاصد سے پوچھا کہ شائستہ کو کتنے پیسوں کی ضرورت ہے۔ قاصِد نے نہایت ہی احترام کے ساتھ پانچ سو روپئے مانگے۔ اور منظور نے انتہائی فیّاضی کے ساتھ اُسے نہ صرف پانچ سو روپئے ہی دیئے بلکہ ایک عدد لفافہ بھی پیش کیا۔

اس طرح کئی دنوں تک وہ خط کے سہارے خوش و خرم رہا۔ بے خیالی اور پیار کا نشہ اس پر ایسا چھایا ہوا تھا کہ وہ سوچ بھی نہ سکا کہ جو لڑکی پیار میں روپئے کی فرمائش کرے وہ کتنی بے غیرت ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا یہ حال تھا کہ اگر شائستہ اُس کی جان لینے کی بھی فرمائش کرتی تو وہ انکار نہ کرتا۔ پیار ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو کبھی کبھی برباد بھی کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ دن اور گزرنے کے بعد اُسے شائستہ کی طرف سے ایک اور خط ملا۔ وہی قاصِد اِس خط کو بھی لایا تھا۔ اس خط میں بھی وہی جملے دوہرائے گئے تھے۔ جھوٹی شان کے قصیدے لکھے گئے تھے اور آخر میں پیسوں کی فرمائش کی گئی تھی چار سو روپیوں کی فرمائش۔ منظور نے یہ فرمائش بھی صدقِ دل سے پوری کر دی مگر بعد میں اُسے ہوش آیا کہ وہ کیا کر چکا ہے۔

بچپن میں اس سے کسی نے کہا تھا کہ جو لوگ پیار کرتے ہیں وہ روپئے پیسے

کا بیوپار نہیں کرتے۔ اور جو لوگ بیوپار کرتے ہیں وہ پیار نہیں کرتے۔ چنانچہ اب اُس نے خود شائستہ سے ملنے اور اس کا ارادہ جاننے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اس کے گھر تو کیا اس محلے کے اردگرد ایسے چکر کاٹنے لگا جیسے شمع کے اردگرد پروانہ۔ مگر شائستہ نے اس طرح خود کو چھپائے رکھا جیسے اندھیرے میں انسان سے اس کا سایا چھپا رہتا ہے۔ اور نتیجتاً منظور لُٹ گیا۔ مالی طور پر بھی اور جانی اعتبار سے بھی ـــــ

اُسے اس بات کا کوئی غم نہیں تھا کہ اس نے اِس بازی میں جوئے کی طرح پیسے داؤ پر لگائے۔ غم تھا تو فقط اس بات کا کہ شائستہ وعدہ وفا کرے یہ تو درکنار، اُس نے اپنا فیصلہ، حتمی بھی خود کیوں نہیں سُنایا۔ اگر وہ اپنے لبوں سے اس کا ساتھ نبھانے سے انکار بھی کرتی تو منظور کو اتنا دکھ نہ پہونچتا جتنا اُسے اس کے چھُپنے سے ہوا تھا۔

غالباً اب وہ زندگی سے مکمل طور پر ہار چکا تھا۔ اسے اپنی طرف دیکھ کر خود سے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ درد کا پیکر کہ ہائے ..... ؎

ترے وعدے پہ جئے ہم تو یہ جان چھوٹ جاتی
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

وہ کس کا اعتبار کرتا؟ شکیلہ کا، جس نے شادی شدہ ہو کر بھی اس کے ساتھ پیار کا ڈھونگ رچایا اور چار دن کی چاندنی بن کر چلی گئی اور گئی گزری ہو گئی۔

ساجدہ کا ـــــ جسے وہ حرفِ غلط کی طرح کتابِ محبت سے اپنے ہاتھوں خود ہی مٹا چکا تھا۔

یا شائستہ کا ـــــ جس نے چند میٹھے بولوں سے اُسے رام کیا تھا اور پیار کی جھوٹی شان کا نام لے کر اُسے لوٹنے کا ارادہ رکھتی تھی ـــــ شکیلہ ڈائن تھی تو شائستہ ایک خوب صورت ناگن ثابت ہوئی۔

منظور اپنے آپ سے سخت بیزار تھا۔ اسے رہ رہ کر اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ اُس

کا بس چلتا تو خودکشی کر لیتا۔ لیکن وہ ایسے گناہ کا ارتکاب بھی کرنا نہیں چاہتا تھا جس کے بعد زندگی بھٹکتے رہنے کا خدشہ ہو۔ اپنے آپ کو ہر طرف سے بے بس پاکر اُسے رونا آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں اگرچہ خشک تھیں لیکن اس کا دل خون کے آنسو بہا رہا تھا وہ جس حد تک پُرانی یادوں سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا اس سے کہیں زیادہ وہ ان میں الجھتا جا رہا تھا۔ وہ چند لمحات کی تسکین کے لیے مچل رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ اس کا دل بھی ٹوٹ چکا تھا اور وہ خود بھی۔ ان دنوں وہ بڑی ناامیدی کی زندگی گزار رہا تھا اپنی اِس بے بسی کو دیکھ کر اور خیالات کا ہیجان دماغ میں پاکر اس کے قدم بے ارادہ طور پر اس منزل کی طرف اٹھنے لگے جہاں ایک زمانے میں وہ ساجدہ سے ملا کرتا تھا، اور پھر وہاں پیار کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ وہاں پہونچ کر اس نے حسرت و یاس سے اِدھر اُدھر نظر ڈالی اور ایک سرد آہ بھر کر بڑی دیر تک ساجدہ کی یادوں میں کھویا رہا۔ ماضی کسی فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا اور یادوں کی بازگشت اپنے ساتھ اُسے بہت دور بہا کر لے گئی۔

"بے شرم ـــ راہ چلتی لڑکیوں سے پیش آنے کا یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟ کسی اور نے تمہاری بات سُن لی ہوتی تو کیا سوچتا، کیا کہتا۔۔۔۔؟"

"یہ ہی کیا کم ہے کہ تم نے سُن لی، میں نہیں چاہتا ہوں کہ تمہارے علاوہ بھی کوئی سُنے۔ کاش تم اسے سمجھنے کی بھی کوشش کرتیں۔"

"تو اس کا مطلب ہے تم کل بھی مجھے چھیڑنے کی نیت سے آئے تھے۔"

"چھیڑنے کی غرض سے نہیں آیا تھا اور نہ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے ہاں البتہ انتظار ضرور کر رہا تھا۔"

"انتظار ـــ! کس کا انتظار کر رہے تھے تم۔۔۔؟"

"تمہارا، اور کس کا ـــ تم ہی تو ہو جس نے محلے میں ایک عجیب سی ہلچل پیدا

کردی ہے۔ جو بھی ملتا ہے بس تیرا ہی افسانہ سُناتا نظر آتا ہے۔ تیری ہی جوانی کے گیت گاتا دکھائی دیتا ہے۔"

"میں تم سے پیار کا خواہش مند ہوں ساجدہ! مجھے یقین ہے کہ تم میری پیش کش کو ٹھکراؤ گی نہیں۔ تمہارا یہ حُسن مجھ پر بجلیاں گرا رہا ہے، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم مجھے اس عتاب سے بچا سکو۔؟"

"ہٹو بھی۔ تم بڑے وہ ہو۔ پیار جتانا کوئی تم سے سیکھے۔ دل لگانا کوئی تم سے جانے۔"

"دل تو کیا تمہارے ایک اشارے پر میں خون بھی بہا سکتا ہوں۔ کہو تو ابھی بہا کر دکھاؤں۔؟"

"تمہارے ارادوں سے مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس خوف سے میرا دم ہی نکل جائے۔"

"خدا نہ کرے۔ تمہارے دم سے ہی تو میرا دم ہے۔ تمہیں کچھ ہوا تو میں خود کو سنبھال نہ پاؤں گا۔ چاہے دنیا کی تمام خوشیاں میرے نام کر دی جائیں۔"

"اچھا۔؟"

"ہاں کہہ دو تو یہ زندگی آج ہی تمہارے نام لکھ دوں کیا معلوم کل کیسا ہو۔"

"اتنی جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ کل جیسا بھی ہو ہمیں بہرحال اس کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"منظور۔ آخر کار تم نے مجھے اپنے پیار سے بے بس کر ہی دیا۔ بے خودی کا یہ عالم ہے کہ میں رہ رہ کر کھوتی جا رہی ہوں، گم ہوتی جا رہی ہوں۔"

"مجھے اپنے نصیب پر فخر ہے ساجدہ! جسے تمہارا پیار مل گیا۔ اندھے کو دو آنکھیں مل گئیں سمجھو۔"

"میں بھی اپنی قسمت پر جتنا ناز کروں کم ہے۔ اس دنیا میں میں نے بہت سے پیار کرنے والوں کو دیکھا لیکن ایک تم ہو جس نے میرے دل میں گھر کر لیا۔ تمہاری محبت کو میں دنیا کی عظیم ترین دولت تصوّر کرتی ہوں اور خدا سے دعا کرتی ہوں کہ ہمارا یہ ربط صدیوں تک بنا رہے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

○

"کیا سوچ رہے ہو ــــ؟"

"دور کے ان بادلوں کو دیکھ رہا ہوں ساجدہ! جو نزدیک ہو کر بھی ایک دوسرے سے ملنے کو بے قرار نظر آتے ہیں۔ تم بھی دیکھ لو نا ــــ"

"بادل کے یہ آوارہ ٹکڑے ہمیں اپنے پیار کی مثال پیش کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہ ہونا۔ کیا تم بھی یہی سوچ رہے ہو ــــ؟"

"ہاں واقعی تم نے میرے دل سے چھین کر بات کہی۔ ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو کر بھی مجھے لگتا ہے کہ ہم دور دور ہیں۔"

"دوریوں کو اب مٹانا ہو گا۔ پیار محبت میں ان کا کیا کام۔"

"تو پھر میرے قریب آنے سے ہچکچاتی کیوں ہو؟ فی الحال گلے لگنے کی ہمّت تو کر لو۔"

○

"ساجدہ! میں ناکامی اور مایوسی کی ایک زندہ تصویر ہوں، ایک زندہ تصویر۔"

"مجھے اِس تصویر میں رنگ بھرنے آتے ہیں، تم جیسا چاہو ویسے رنگ بھر دوں گی۔"

"ہاں تم ہی اس بے رنگ تصویر میں رنگ بھر سکتی ہو اور کوئی ایسا نہیں

کر پائے گا۔"

"اچھا یہ بتاؤ مجھے کتنا چاہتے ہو؟"

"بہت ___!!"

"اگر کوئی تم سے مجھے چھین لے گیا تو ___؟"

"ارے کس میں اتنا دم ہے جو تمہیں مجھ سے چھین سکے۔ اس ماں کے لال نے اس دھرتی پر جنم لیا ہوگا اور نہ کبھی لے سکے گا۔ اسے اپنی جان پیاری نہیں ہے کیا؟"

"میں تقدیر کی بات کر رہی ہوں، جس کے آگے کبھی کبھی انسان بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔"

"تقدیر کو بدلنا ہوگا ساجدہ، تقدیر کو بدلنا ہوگا۔ اگر اس نے کبھی تمہیں مجھ سے جدا کرنے کی کوشش کی تو میں ساری دنیا کو آگ لگا دوں گا۔"

○

"منظور ___! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"ایک کس نے کہا دس باتیں کرو، سو کرو۔ لیکن اتنا تو بتاؤ کہ بات کیا ہے جو تم اس قدر پریشان دکھائی دے رہی ہو ___"

"دیکھو ساجدہ! میرا امتحان لینے کی کوشش مت کرنا، اِن باتوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ خدا کے لیے بتاؤ کہ بات کیا ہے جو تم اِس طرح آنسو بہا رہی ہو ___؟"

"میری سمجھ میں خود بھی نہیں آ رہا ہے کہ بات دراصل کیا ہے۔ میرا احساس مجھے مارے ڈال رہا ہے منظور! آخر تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں۔"

"میں تمہارے احساس کی قدر کرتا ہوں۔ چلو پونچھ ڈالو یہ آنسو، اور ہنسو مسکراؤ۔"

○

"میں نے تو سُنا تھا آپ کی شادی ہو چکی ہے۔"

"تو کیا شادی کوئی قید خانہ ہے جس سے انسان کو باہر نکلنے کی اجازت نہ ہو"
"مَن کی مراد پانے والے تو خوش نصیب ہوتے ہیں پھر بھی آپ کہہ رہی ہیں کہ کس قابل ہوں۔"

"مَیں نے کون سی مراد پائی ہے ؟"

"آپ کچھ سوچتے ہی نہیں تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس سے کچھ نہ ہوگا۔ فی الحال آپ اُس دائرے سے نکلنے کی کوشش تو کیجیے جس میں آپ نے خود کو قید کر لیا ہے اور دیکھیے کہ دنیا کتنی رنگین ہے، کتنی دلکش ہے۔"

"اگر شادی کے بعد بھی کسی عورت کو محبّت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو میرے خیال میں تم وہ پہلی عورت ہو۔"

"مَیں عورت نہیں ہوں اور نہ عورت بننے کا ابھی شوق ہے۔ اور نہ ہی مَیں وہ پہلی دوشیزہ ہوں جسے شادی کے بعد بھی کوئی نظرِ التفات بخش دے۔"

○

"یہ ضروری تو نہیں کہ دونوں کے درمیان رازداری کی باتیں ہی ہوئی ہوں، ممکن ہے کچھ رسمی باتیں ہی ہوئی ہوں۔"

"ارے میاں کیا بات کرتے ہیں آپ بھی عشق و محبّت کی باتیں نہ ہوتیں تو اتنی شام گئے ملنے اور چھپ چھپ کر باتیں کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ رسمی یا گھریلو قسم کی باتیں تو دن میں بھی ہو سکتی ہیں۔"

"تم نے ایک شادی شدہ عورت کو ورغلایا جو کہ ایک گناہ ہے۔ ایک ایسا گناہ جس کی تلافی کبھی نہ ہوگی۔"

"شکیلہ اب تم میری ہو، اب راستہ صاف ہے۔"

"مجھے اس بات کی انتہائی مسرت ہے ساجدہ راہ کا کانٹا تھی۔ خود بخود ہٹ گئی۔"

"میں تم دونوں کی راہ کا کانٹا تھی۔ خود بخود ہٹ گئی ___ تمہیں مبارک ہو یہ پیار کا نیا سودا۔"

"ذلیل، کمینے، تیچ تم انسان کے بھیس میں شیطان ہو، اور اپنے اس شیطانی جال میں پھنساتے ہوئے تمہیں اس بات کا بھی احساس نہ ہوا کہ میں ایک عورت ہوں مجھ پر بدنامی کا وہ داغ لگ سکتا ہے جو مجھے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رکھ سکے گا۔"

"ساجدہ ___ !!"

"ذلیل عورت ___ تم تو عورت ذات پر دھبہ ہو۔ تمہیں عورت کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔"

"کم ذات اوروں پر کیچڑ اچھالتے ہوئے یہ بات تم بھول رہی ہو کہ تم نے بھی کوئی جُرم کیا ہے۔"

○

"راشد ___! یہ تم کس دشمنی کا بدلہ لے رہے ہو مجھ سے، میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم نے مجھ سے میرا صبر و قرار چھین لیا ___"

"یہ ایک درد بھری کہانی ہے میرے بھائی! شاید تم سُن کر یقین نہ کرو گے اور اگر یقین کر بھی لو تو اس سے کیا ہو گا، تیر تو کمان سے نکل چکا ہے۔"

"میں اُس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں، اسی صورت میں مجھ کو تسکین مل سکتی ہے میں نے اُسے بہت دُکھ دیئے ہیں۔"

"گناہوں سے نجات پانے اور معافی مانگنے سے اب ہو بھی کیا سکتا ہے اب تو وہ شاید ہی تم سے ملنا پسند کرے گی۔"

"مگر کیوں ___؟ کیا میں اس قابل بھی نہیں؟"

"نہیں ایسی بات نہیں ___ بات دراصل یہ ہے کہ اب ساجدہ کی نسبت

طے ہو چکی ہے۔ اُس کے گھر والے اُسے باہر نکلنے ہی نہیں دیتے ۔۔۔"

"اس کی نسبت طے ہو گئی ہے ؟ کیا کہتے ہو راشد! کب ہوا ایسا۔۔؟"

"جب تقدیر کو منظور تھا۔"

"مگر تقدیر کو یہ کیا منظور تھا۔۔۔" وہ بڑبڑا کر خیالات سے اچانک چونک کر خود سے ہی بولا۔ اس کی آنکھیں شدتِ غم سے بھیگ چکی تھیں۔ وہ سراپا حسرت ویاس کا پیکر بنا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد ناامیدی اور بے یقینی کے گھور اندھیرے پھیلتے جا رہے تھے۔ وہ حیران و پریشان سا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اُس کی زندگی مذاق کیوں بنی آخر؟

دو موٹے موٹے آنسو اس کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے لڑھک کر زمین کے دامن میں پیوست ہو چکے تھے۔ دو حقیر سے آنسو، دو ناچیز آنسو، جن کی کوئی قیمت نہ تھی۔ جن کی کوئی حیثیت نہ تھی، جن کی کوئی قدر نہ تھی ۔۔۔ اور پھر اس نے نئے ہی طریقے سے سوچنا شروع کیا۔ ایک نیا جوش، نیا حوصلہ، نیا ولولہ اس کے اندر بیدار ہوا ۔۔۔ اُس نے آنکھوں کی نمی کو کُرتے کے دامن سے صاف کیا اور زیرِ لب بڑبڑایا۔

"تقدیر کو بدلنا ہوگا ساجدہ ۔۔۔! تقدیر کو بدلنا ہوگا۔ اگر اس نے کبھی تمہیں مجھ سے جُدا کرنے کی کوشش کی تو میں ساری دنیا کو آگ لگا دوں گا۔"

"تم کچھ بھی نہیں کر سکتے ہو۔ نہ تقدیر کو بدل سکتے ہو اور نہ ہی دنیا کو نذرِ آتش کرنے کی تم میں طاقت ہے۔" کسی نے رُندھی ہوئی آواز میں کہیں نزدیک ہی سے کہا۔

منظور حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پہلی نظر میں اُسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ یہ شاید اس کا وہم ہے کہ کوئی قریب آ کر تڑپ کر رو دیا۔

منظور نے غور سے دیکھا۔ اُس کے سارے جسم میں کپکپاہٹ پھیل گئی دل بھی کچھ

اس طرح سے دھڑک اٹھا جیسے قریب ہی کوئی بم پھٹ گیا ہو۔ اپنے سامنے ساجدہ کو دیکھ کر اُسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ ساجدہ کو دیکھ رہی ہیں۔ کہاں رہ گئی تھیں وہ آنکھیں جو ساجدہ کے حُسن کی تاب نہ لاسکتی تھیں۔ وہ زبان کہاں سے لاتا جو محبت کے باب میں کُھل جاتی۔ وہ ایک آنکھوں والا اندھا تھا، زبان والا گونگا تھا، کانوں والا بہرا تھا۔ اس وقت وہ بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔

جذبات کی ایک لہر اس کے دل سے ٹکرا گئی اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے دل کو سنبھال کر کچھ کہنے کی ہمّت کرتا ساجدہ سِسک پڑی اور بولی ــــ

"آج شام کو تمہارے محلے سے میرا جنازہ اُٹھنے والا ہے ہو سکے تو کندھا دینے ضرور آنا۔" اور اتنا کہنے کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور پھر سر جھکائے چلی گئی۔ منظور لاکھ چاہنے پر بھی اسے روک نہ سکا، کوشش کے باوجود وہ اپنی زبان نہ کھول سکا۔ چاہتے ہوئے بھی دو قدم اس کے ساتھ نہ چل سکا۔ یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ کہاں سے آئی اور کہاں کو چلی گئی۔ اور بے خیالی میں اُس کے مُنہ سے نکلا ــــ "ساجدہ ......!!"

پھر وہ لڑکھڑا، گرتا پڑتا، آنکھوں میں آنسو، دل میں درد لیے بوجھل قدموں سے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔

بارہ

وقتِ مقررہ پر ساجدہ کی ڈولی رخصت ہوئی۔ سارا گاؤں جمع ہو گیا تھا۔ بوڑھے بچے، جوان، مرد، عورت سبھی۔ کسی کی آنکھوں میں آنسو تھے، کسی کے چہرے پر بشاشت تھی۔ کسی کی زبان گنگ تھی اور کوئی اونچے بول بولتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک عجیب سی ہلچل تھی۔ ایک عجیب سا عالم تھا۔ اور اس عجیب سی ہلچل میں منظور کا لڑکھڑاتا گرتا سنبھلتا وجود بھی تھا۔ وہ ایک ایسی اداسی محسوس کر رہا تھا جیسے خود اُس کے جسم سے جان جا رہی ہو۔ وہ آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دنیا اس کی آنکھوں میں تاریک ہو کر رہ گئی ہو، ہر طرف اندھیرا تھا بھیانک اندھیرا، دل کو ہلا دینے والا اندھیرا۔ وہ اس اندھیرے سے خوف کھا رہا تھا۔ اس طرح سے وہ آج تک زندگی میں کبھی بے بس نہ ہوا تھا۔ کبھی مجبور نہ ہوا تھا۔ کبھی وہ کسی سے مدد کا طالب نظر نہ آیا تھا۔ مگر —— مگر آج وہ ہر طرف امید کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن کوئی ایسا نہ تھا جو اُسے سہارا دے سکتا۔ رات کے اس گھور اندھیرے میں اُسے ایسا کوئی نہ ملا جو اس کے بکھرے ہوئے بال، لڑکھڑاتا ہوا وجود، چہرے کی مُردنی، آنکھوں کی ویرانی، دل کی بیتابی اور بدن کی تھرتھراہٹ کو سمجھ سکتا۔ اِس دنیا میں سبھی اُس کے اپنے تھے مگر صحیح معنوں میں کوئی چاہنے والا، اپنانے والا، درد کو محسوس کرنے والا، اُس کے دُکھ کو سمجھنے والا، اور اُس کی دیرینہ پیاس کو بجھانے والا کوئی نہیں تھا۔

وہ بھری دنیا میں اکیلا تھا۔ بالکل اکیلا، بالکل تنہا۔ اور تنہائی کا یہ عالم تھا کہ اُسے بڑی اکتاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اپنے کو یا تو موت کے منہ میں دھکیلنے کا خواہش مند تھا یا پھر ــــــ

یا پھر فرار کا کوئی دوسرا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ لیکن وہ دوبارہ زندگی کو اُجاگر کرنے کے حق میں بھی نہ تھا۔

گھر آ کر وہ از سرِ نو بسترِ علالت سے چپک گیا۔ اور کئی دنوں تک وہیں پڑا رہا۔ پھر ایک دن جب وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا کسی نے آکر اسے خبر دی کہ گھر میں مہمان آئے ہیں۔ اُسے بھلا مہمانوں سے کیا سروکار تھا۔ اُس نے سنی اَن سنی کر دی اور پھر سے آنکھیں موند لیں اور نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ جب شام کو پیاس کی شدّت سے آنکھ کھُلی تو وہ دیکھتا ہی رہ گیا ــــــ اُس کے بستر کے قریب بیٹھی ایک خوب صورت لڑکی آہستہ آہستہ اُس کا سر دبا رہی تھی۔ پہلی بار اُسے ایسا لگا جیسے ساجدہ قریب بیٹھی ہے وہ اس قدر حیران تھا جیسے اُس کے سامنے جنّت کی کوئی حور ہو۔ فرطِ ندامت سے اس کی کھُلی ہوئی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اور اس سے پہلے کہ وہ زبان کھول کر کچھ کہتا۔ خوب صورت لڑکی نے نہایت ہی نرم اور شیریں لہجے میں پوچھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

آواز ساجدہ کی نہ تھی اُس نے سُنتے ہی محسوس کر لیا۔ اور پھر مہمان نوازی کا خیال کرتے ہوئے بولا۔

"آپ نے اتنی تکلیف کیوں کی، نہ جانے کب سے میرا سر دبا رہی ہوں گی۔"

"اس میں تکلیف کی کون سی بات ہے یہ تو میرا فرض ہے۔"

"فرض ــــــ" وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "کسی کام کو فرض ماننا بھی اتنا آسان نہیں جتنا شاید آپ سمجھ رہی ہیں۔"

"فرض سمجھنا تو آسان ہے لیکن فرض پورا کرنا بہت مشکل ہے۔ شاید یہی کہنا چاہتے ہیں آپ ۔۔۔" وہ ایک ادا کے ساتھ بولی۔

"شاید ۔۔۔" وہ کمزور آواز میں بولا۔

"آپ اس قدر اداس اور مایوس کیوں نظر آتے ہیں؟ مجھے لگتا ہے کہ آپ نے خود کو خود ہی بستر علالت کے حوالے کر دیا ہے۔ کیا اس میں آپ کی کوئی مصلحت ہے؟"

"مصلحت ۔۔۔" وہ کھوکھلی ہنسی ہنسا۔ "کیا کسی کی یہ مصلحت ہوگی کہ وہ خود کو بیمار ثابت کرنے کے لیے بستر کے ساتھ چپک جائے ۔۔۔؟"

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔"

"ہوتا ہوگا۔ لیکن میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"ہے کیوں نہیں، کچھ تو ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔ "اکثر اوقات آدمی دوسروں کا درد مول لے لیتا ہے اور وہ درد اس کے اندر اس طرح سرایت کر جاتا ہے گویا اس کا اپنا ہی درد ہو، اپنی ہی تکلیف ہو ۔۔۔"

"یہ ہو سکتا ہے۔" منظور آخر کار سچ کو تسلیم کر گیا۔ "جب دو انسان ایک دوسرے کا درد بانٹتے ہیں اور اُن میں سے ایک کسی موڑ پر اپنا دامن بچا لیتا ہے تو ظاہر ہے دوسرے کا بوجھ بڑھ ہی جاتا ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں وہ دوسرے انسان آپ ہی ہیں جس کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔"

"ہو سکتا ہے ۔۔۔" وہ پژمردہ آواز میں بولا۔ اور پھر اچانک اُسے اس بات کا خیال آگیا کہ وہ ابھی تک اپنے ساتھ بات کرنے والی لڑکی کا نام بھی نہیں پوچھ سکا ہے۔ یہ احساس پیدا ہوتے ہی اُس نے کہا۔ "آپ نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔"

"نام بتا بھی دوں تو کیا آپ بستر چھوڑ دیں گے؟" وہ طنزیہ بولی۔ اور منظور کھسیا کر بستر چھوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

"بیٹھے رہیئے ـ" وہ اس کا درد محسوس کرتے ہوئے بول پڑی۔ "آپ کو تکلیف زیادہ ہو رہی ہے۔ چلئے میں اپنا تعارف کرا رہی ہوں۔ میرا نام تسلیمہ ہے اور میں لنگیٹ کی رہنے والی ہوں۔ کل ہم جب آپ کے یہاں آئے تو میں نے آپ کی بیماری کی خبر سُنی، دل نے چاہا کہ آپ کے پاس بیٹھوں اور کچھ باتیں کروں ـ اور بس میں آگئی ـ"

منظور اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ بہت کمزوری محسوس کر رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ کراہ بھی رہا تھا۔ وہ بولا۔

"تسلیمہ جی! ان چند لمحوں کو میں بڑی مدّت تک یاد کرتا رہوں گا جو آپ مجھ سے باتیں کرنے میں صرف کر رہی ہیں۔"

"صرف یاد رکھنے سے ہی بات نہیں بنے گی، آپ کو اس کا معاوضہ دینا پڑے گا۔" وہ ہنسی اور منظور بھی پہلی بار مسکرایا۔ اور پھر بولا ـــ

"اگر میری مقدرت میں ہوا تو ضرور دوں گا۔ آپ اس بات کی فکر نہ کریں۔"

"میں کیوں فکر کروں، مجھے تو پوری امید ہے کہ آپ سے معاوضہ ضرور مل جائے گا۔"

"وہ تو چکاؤں گا ہی، لیکن یہ بتائیے کہ آپ کب تک یہاں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتی ہیں ـــ؟"

"کہیئے تو ابھی واپس ہو لوں۔" وہ پھر چہکی اور منظور شرمندہ ہو گیا۔

"ابھی تو آئی ہو اور ابھی جانے کی بھی تو خوب کہی۔ میرا مطلب ہے ابھی کچھ دن یہیں رہیئے۔"

"میرے یہاں رُکنے سے اگر آپ تندرست ہوتے ہیں تو ضرور رُک جاؤں گی۔"

"کوشش کروں گا اپنا درد چھپانے کی۔"

"نہیں، اس صورت میں تو میرا ہی نقصان ہے۔"

"وہ کیسے ـــ؟" منظور معصومیت سے بولا۔

"جب آپ صحت یاب ہونے کی کوشش ہی نہیں کریں گے اور آپ کے اندر کا زخم رِستا ہی رہے گا تو میرا معاوضہ کون دے گا۔"

منظور زور سے ہنس دیا۔ اور بولا۔ "بڑی چنچل ہیں آپ! چلئے میں ٹھیک ہونے کی کوشش کروں گا۔ اب تو آپ کا ارادہ بدل گیا نا۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ مگر اتنا ہی کہ اب میں آپ سے کوئی معاوضہ نہیں مانگوں گی، اب تو خوش ہو نا۔۔۔؟"

"ایک صورت میں میں خوش ہو سکتا ہوں۔"

"وہ صورت جلدی سے بتایئے، میں بجا لانے کی کوشش کروں گی، میرا مطلب ہے پورا کرنے کی سعی کروں گی۔"

"میرے لیے خدا سے دعا کیجئے کہ میرے سارے دُکھ درد دُور ہو جائیں اور میں آیندہ خوش و خرم رہ سکوں۔"

"ضرور مگر ایک شرط پر۔۔۔"

"وہ کون سی۔۔؟"

"یہی کہ اپنی آپ بیتی مجھے بھی سُناؤ گے۔"

"اس سے آپ کو کیا ملے گا؟ اور پھر میری آپ بیتی میں رکھا بھی کیا ہے سوائے رنج، غم، کرب، تہمت اور دشنام کے۔ میرا ماضی میری ذلّت کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ بھی ہو آپ کو سُنانی ہی ہو گی اپنی داستان۔"

"اچھا۔۔۔" وہ ایک سرد آہ کے ساتھ بولا۔ "اگر آپ کی یہی ضد ہے تو ضرور سُناؤں گا۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" وہ مسکرا دی۔ "اچھا اب آپ بستر سے اُٹھیئے اور ذرا باہر کی سیر کر کے آیئے تب تک میں کمرے کی صفائی کرتی ہوں کتنا گندا ہو رہا ہے۔"

"شاید غالب نے ایسی ہی دیوانگی کے عالم کو دیکھ کر یہ شعر کہا ہو گا کہ ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

منظور کہتا ہوا آہستہ آہستہ کمرے سے نکل گیا اور تسلیمہ کمرے کی صفائی میں لگ گئی ـــــ اس طرح تسلیمہ بھی دھیرے دھیرے اُن لڑکیوں کی صف میں شامل ہو گئی جو منظور کی زندگی میں آچکی تھیں۔ ساجدہ، شکیلہ اور شائستہ کے بعد تسلیمہ چوتھی لڑکی تھی۔ وہ تینوں تو معمولی جھلکیں دکھا کر معدوم ہو گئی تھیں لیکن منظور کی زندگی میں پھر ویسا ہی بھنور پڑ گیا۔ پہلے اُس کا خیال تھا کہ تسلیمہ بھی چند دنوں کی مہمان ہے۔ تھوڑے ہی دن بعد چلی جائے گی۔ حالانکہ منظور اپنی کیفیت کو چھُپانے کی حتی الامکان کوشش کرتا رہا۔ لیکن جب وہ اُس گھر کی ایک مستقل فرد ثابت ہوئی اور دن بہ دن منظور اس کو اپنے قریب محسوس کرنے لگا اور تسلیمہ کا ہاتھ منظور کے زخم تک پہونچ گیا تو وہ پھوٹ پڑا۔ اُس نے اپنی ساری داستان تسلیمہ کو سُنادی ـــــ اور جب کہانی ختم ہوئی تو ایک نئی کہانی کا آغاز ہو چکا تھا۔ تسلیمہ کے چہرے کے تاثرات میں منظور کو اُجالے کی نہ جانے کون سی کرن نظر آئی کہ وہ پھر اُسی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھا جس کی سزا اب تک بھگت رہا تھا۔ ایک ایسی غلطی جو وہ پہلے ہی کئی بار کر چکا تھا ـــ اُس نے تسلیمہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اُس سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے۔ وہ ہر بار اپنی زندگی کو اسی محدود دائرے میں قید کرنے کے حق میں تھا دوسری کوئی بات سُننے سے اُسے کوئی غرض نہیں تھی۔

یہ وہ دائرہ تھا جس میں عرصہ دراز سے وہ بھٹک رہا تھا۔ اس دائرے میں رہ کر زندگی گزارنے کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ کوئی اُسے چاہے۔ چاہتے تو سبھی تھے اُس کو، گرچہ اس نے کچھ بشری غلطیاں بھی کی تھیں اب جن کا ازالہ بھی ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ کوئی اُسے چاہے۔ کوئی پیار کے دو بول بولے۔ کوئی اُس سے دل کی تسکین کی بات کرے وہ پیاسا تھا، اتنا پیاسا کہ کئی سمندر مل کر بھی شاید اس کی پیاس نہیں بُجھا سکتے تھے۔ کیونکہ

اُس کی یہ پیاس کسی کا پیار ہی بُجھا سکتا تھا۔ وہ ہر ملنے والی لڑکی سے یہی تقاضہ کرتا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرے۔ شاید شادی ہی اُس کی برسوں کی پیاس بُجھا سکتی تھی تبھی تو اس نے تسلیمہ سے بھی یہی تقاضہ کیا تھا۔

تسلیمہ اُس کے ارادے کو جان کر مطمئن ہوگئی تھی اس نے منظور سے شادی کرنے یا نہ کرنے کا ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ وہ تو ابھی ایک تماشائی کی طرح منظور کی بے تابی پر دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔ لیکن جب منظور نے اس کا فیصلہ سُننے کی ضد کی تو وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی کہ ــــ "جس خاندان سے میرا تعلق ہے وہ لڑکی کے حد سے باہر نکلنے کے بالکل خلاف ہیں۔ وہ بے غیرت نہیں ہیں کہ لڑکی کو اتنا آزاد چھوڑ دیں کہ وہ اپنے لیے جیون ساتھی بھی خود چُن لے۔ میری شادی جہاں میرے والدین طے کریں گے، مجھے سر آنکھوں پر تسلیم ہوگا۔ ہم اِن باتوں کے بالکل خلاف ہیں کہ گھر دیکھیں، گھر والے دیکھیں، ذات پات کا لحاظ کریں۔ تقدیر میں جہاں لکھا ہوگا وہیں ہو جائے گی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تقدیر مجھے آپ سے ہی ملا دے۔ میرے گھر پیغام بھیجئے، تقدیر میں لکھا ہوگا تو ہمارا رشتہ طے ہو سکتا ہے ہاں خود میں انکار یا اقرار نہیں کر سکتی۔ کیونکہ میں دوسری لڑکیوں کی طرح بے غیرت یا بازارو قسم کی لڑکی نہیں ہوں۔"

منظور پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اسے اپنی بات کا بہت صدمہ ہوا۔ یہ اس کی ایک اور بڑی غلطی تھی کہ اس نے تسلیمہ کو بھی اُنہیں لڑکیوں کی صف میں شامل کر لیا تھا جو آج تک اس کی زندگی میں پے در پے آچکی تھیں۔

جب تین مہینے کی لمبی مدّت کے بعد تسلیمہ اپنے گھر جانے کی تیاریوں میں لگ گئی تو منظور کو ایک بار پھر ساجدہ کی ڈولی اُٹھنے کا منظر یاد آگیا۔ اس کا دل پھر اسی طرح بے قرار ہو اٹھا۔ مگر حسرت بھری نظروں سے دیکھنے کے سوا وہ کچھ بھی نہ کر سکا اور بڑے ضبط و تحمل کے ساتھ اُن اشکوں کو پی گیا جو اس کی آنکھوں میں مچل رہے تھے۔

تسلیمہ نے چلتے وقت سب سے رخصت لی اور جب منظور کی طرف اس نے الوداعی نظروں سے دیکھا تو پہلی بار وہ اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا تسلیمہ بول پڑی " اتنے اداس مت ہو میرے دوست! میں خطوط کے ذریعہ تمہاری خیر خبر رکھوں گی اور یہ خبر بھی بھیج دوں گی کہ میرے والدین اس شادی کے لیے رضا مند ہیں یا نہیں۔ اور خدا سے ہمیشہ یہی دعا کرتی رہوں گی کہ تمہیں دلی سکون ملے۔ مسرتیں اور شادمانیاں تمہارے قدم چومیں۔ خوشیوں سے تمہارا دامن بھرا رہے اور...."

اس کے آگے وہ کچھ نہ بول سکی اس کا گلا بھر آیا تھا آواز رندھ گئی تھی۔ اور پھر وہ منظور کے گھر سے جدا ہو گئی۔ منظور سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دنیا کی تمام خوشیوں اور مسرتوں سے محروم ہو گیا ہے۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتا ہوا مڑا۔ " تسلیمہ تمہاری خالی خالی دعائیں مجھے راس نہیں آئیں گی اور نا ہی اب میں یہ چاہتا ہوں کہ کوئی میرے لیے خدا سے دعا مانگے۔ اب نہ مجھے زندگی کی خوشیاں راہِ راست پر لا سکتی ہیں نہ کسی کی جھوٹی تسلیاں۔"

سچ تو یہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ ساری دنیا سے بیزار اور مایوس ہو گیا تھا مسلسل ناکامیوں نے اُسے مفلوج کر دیا تھا اسے کسی کا یقین نہیں رہا تھا اس کے باوجود اس نے تسلیمہ کا لگاتار ایک سال تک انتظار کیا مگر اس کی مثال تو اس شعر کی طرح حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی کہ ؎

آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

اور تسلیمہ کے ظلم کی انتہا اس وقت ہو گئی جب ایک سال کے مسلسل انتظار کے بعد بھی اس کی طرف سے کوئی پیغام نہ آیا۔ کبھی کبھی منظور کو ایسا لگتا تھا جیسے اُس نے کوئی خواب دیکھا تھا اور جب آنکھ کھلی تو خواب ٹوٹ گیا حقیقت میں نہ کوئی تسلیمہ

نام کی لڑکی تھی اور نہ کبھی وہ اُس سے ملا۔ اگر کچھ سچّائی ہوتی تو کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں وہ اس سے ضرور ملتی یا پھر کوئی خیر خبر بھیجتی۔

اب اُسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ دنیا ہی ایک خواب ہے یہاں کی ہر چیز جھوٹی ہے ہر شخص جھوٹا ہے۔ ہر دلاسہ، ہر تسلّی اور ہر رشتہ ایک فریب ہے ایک دھوکا ہے۔ ہاں اگر سچّائی ہے تو بس خدا کی ذات میں۔ وہی وحدہٗ لاشریک ایک حقیقت ہے جو اس ساری کائنات کا مالک ہے۔

گھر میں کبھی تسلیمہ کا ذکر بھی ہوتا تو اُسے یقین نہ آتا تھا کہ یہ اُسی تسلیمہ کی باتیں ہو رہی ہیں جو کبھی اس گھر میں آئی تھی، جس نے اُس کی تیمارداری کی تھی، جسے وہ اپنا مسیحا سمجھ بیٹھا تھا، جس کی یادوں کی خوشبو آج بھی اُس کے دل میں محفوظ تھی۔

اب وہ ہر وقت کھویا کھویا رہنے لگا تھا۔ دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز، اُسے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کئی دنوں سے اس نے نہ شیو کیا تھا نہ بال سنوارے تھے نہ کسی سے کھُل کر بات کی تھی نہ کسی بات پر ہنسا تھا ـــ اِن دنوں بس ایک ہی کام وہ لگن اور دلچسپی سے کر رہا تھا ـــ خدا کی عبادت۔

ایسا کرتے ہوئے اُسے ابدی سکون مل رہا تھا۔

تبرہ

ایک لمبی مدّت تک گوشہ نشین رہنے کے بعد فضا کی رنگینی اور سہانے موسم نے اُسے باہر کی دنیا یاد دلائی۔ اُسے کوئی اور صورت نظر نہ آئی سوائے اس کے کہ وہ ایک خوش حال زندگی گزارنے کے لیے پچھلی تمام یادوں کو یکسر بھول جائے اور نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرے۔ باہر کی دنیا کو جب اُس نے دیکھا تو وہاں زندگی ہی زندگی تھی نئے عزم کے ساتھ اُس نے نئی دنیا میں قدم رکھے تو وہاں کی رنگینی اور رعنائی میں جلد ہی وہ اپنی پچھلی زندگی کو بھول گیا اور دل سے زخموں کی ساری خراشیں مٹ گئیں اور زندگی کے نئے تقاضے سر اُٹھانے لگے۔ نیا ولولہ، نیا جوش اور نئی امنگوں نے اس کا دامن تھام لیا۔

انسان آخر کب تک اپنے ماضی پر آنسو بہا سکتا ہے۔ ایک نہ ایک دن اس کو قدرت کے تقاضوں کا احترام کرنا ہی پڑتا ہے۔ منظور کے لیے نئی زندگی کا آغاز بھی قدرت کا ایک تقاضہ ہی تھا جس کا احترام اُسے کرنا پڑا۔

موسم پر فضا کی رنگینی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ ہر سو رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے۔ سانسوں میں خوشبو گھُلی جا رہی تھی۔ پیڑوں پر چڑیاں پیار کے ترانے گاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ بڑا پُر کیف موسم تھا۔۔ ایسے میں ایک دن پھر وہی صورت اس کے سامنے آ کر ٹھہری جو یہ تقاضہ کر رہی تھی کہ بھری جوانی میں زندگی کا تنہا سفر مشکل ہے۔ ایسے میں کسی ہم سفر کا ہونا بہت ضروری ہے۔

منظور کے سامنے پھر وہی تپتا ہوا صحرا تھا، وہی تمازت تھی اور وہی پیاس تھی جس سے وہ دامن بچا کر بھاگ آیا تھا۔ لیکن اُس کی جبلّت نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ موسم کی رنگینی اور دل کا اضطراب اُسے پھر اُسی موڑ پر لے آیا تھا۔

ایک عجیب اُلجھن میں پھنس گیا تھا وہ۔ دل کی خلش اُسے بے چین کئے دے رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ بے چینی، یہ اضطراب آخر کیوں ہے۔ زندگی اس سے کیا چاہتی ہے۔

اسی کشمکش میں کئی دن گزر گئے اور وہ اُلجھتا گیا۔ نشے اور سرور کی ماری ہوئی اُس کی آنکھیں نہ جانے کب سے کسی کا خواب دیکھ رہی تھیں۔ یہ وہی خواب تھا جسے اب سے پہلے وہ کئی بار دیکھ چکا تھا مگر تعبیر نہیں ملتی تھی۔ لیکن اِس بار وہ تعبیر چاہتا تھا صرف خواب دیکھنے سے ہی تو زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی تھی۔

چنانچہ وہ کئی دن تک سوچتا رہا کہ کیا کیا جائے۔ اس مرتبہ وہ ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ تیر کس زاویے سے پھینکا جائے جو نشانہ خطا نہ ہو۔ ایسا سوچتے ہوئے اُسے پُرانے تلخ واقعات اور اپنی رسوائی اور بدنامی کے قصے بھی یاد آرہے تھے۔ وہ آہیں بھر کر رہ جاتا ـــ کتنا بھیانک گزرا تھا اس کا ماضی ـــ کتنا اذیت ناک دور تھا وہ۔ گزرے وقت کو یاد کر کے کانپ اٹھتا تھا وہ۔

"تو کیا تم پھر اُسی راستے پر چل پڑے ہو منظور ـــ!" وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا خود ہی خود بڑبڑایا۔ "نہیں نہیں میں اس راستے پر نہیں چل رہا ہوں۔ وہ میری نادانی تھی، میرا بچپنا تھا، میری بھول تھی۔ لیکن اب میں ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے۔" عالم بے خودی میں وہ بولتا چلا جا رہا تھا۔ اتنے ہی میں کسی نے آکر اُسے چونکا دیا۔

خیالات کی دنیا سے باہر نکلا تو سامنے حمید کو پایا۔ حمید جو اُس کا پُرانا ساتھی تھا

اُسے دیکھتے ہی وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، حمید نے اُسے چھیڑا۔

"کیوں میاں کس کا خواب دیکھ رہے ہو؟"

"ہے کوئی..... تمہیں کیوں بتاؤں.....؟" منظور نے بھی دل لگی کی۔ اور پھر دونوں مسکرا دیئے۔

"عجیب آدمی ہو اتنی ٹھوکریں کھا کر بھی نہیں سنبھل سکے۔ حیرت تو یہ ہے اتنے زخم کھا کر بھی زندہ ہو۔ کتنی لڑکیاں تمہاری زندگی میں آئیں اور چلی گئیں اور تم ہو کہ مسلسل خواب دیکھتے چلے جا رہے ہو۔ خوابوں کا یہ سلسلہ آخر کب ختم ہوگا؟ میری بات مانو اور کسی اچھی نیک شریف لڑکی سے شادی کر کے اپنا گھر بسا لو، خوابوں کی دنیا سے نکلو اور حقیقت کی دنیا میں آؤ۔ اس جوانی کو خوابوں کی نذر مت کرو۔ ویسے تمہاری قسمت ہی کچھ اچھی ہے کیونکہ ایک لڑکی کو ٹھکراتے ہو، اور دوسری خود بہ خود تمہارے جال میں پھنس جاتی ہے۔ پتہ نہیں کہ ایسا کون سا منتر ہے تمہارے پاس جو لڑکیاں تم پر مرتی ہیں—؛ ہمیں بھی کچھ بتا دو یار!"

"کہہ چکے— یا کچھ اور کہنا باقی ہے؟" منظور نے حمید سے پوچھا۔

"میں تو کہہ چکا لیکن اب تم یہ بتاؤ کہ اب تمہارا نشانہ کس پر ہے—؟" حمید نے پھر طنز کیا۔

"دیکھو حمید! جہاں یہ سچ ہے کہ میں نے ٹھوکریں کھائی ہیں وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مجھے بہت تجربہ ہوا ہے اور میں بڑی حد تک سنبھل چکا ہوں اور اسی لیے اب میں عشق و محبت کے معاملے میں بہت سنجیدہ ہو گیا ہوں۔ اور بڑی سنجیدگی سے اب گھر بسانے کی بات سوچ رہا ہوں۔ اب میں خواب نہیں دیکھتا ہوں بلکہ تعبیر کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ میں اپنی جوانی کو اب اور رائیگاں ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں تمہاری یہ بات سچ ہے کہ میری قسمت لڑکیوں کے معاملے میں اچھی ہے مگر یہ بالکل غلط ہے کہ میں لڑکیوں کو پھنساتا ہوں بلکہ وہ خود ہی مجھے پھانس لیتی ہیں۔ میرے پاس کوئی

جادو، منتر نہیں ہے۔ اور نہ ہی آج کل کوئی میرے نشانے پر ہے بس اب تو مجھے کسی شریف لڑکی کی تلاش ہے جس سے شادی کر کے میں اپنا گھر بسا سکوں۔"

"چلو بھئی مان لیتے ہیں کہ تمہارے پاس کوئی جادو کوئی منتر نہیں ہے تم لڑکیوں کو نہیں پھانستے ہو وہی تمہیں اپنے پریم جال میں پھانس لیتی ہیں، یہ بھی مان لیا کہ اب تم شادی کر کے گھر بسانے کے موڈ میں ہو، چلو اچھا ہے ارادہ نیک ہے خدا مبارک کرے لیکن یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی ہے کہ اِن دنوں تمہارے نشانے کی زد میں کوئی نہیں ہے ـــــ"

"ہاں بھئی کوئی نہیں ہے یقین کرو میرا، میں سچ کہہ رہا ہوں۔" منظور نے حمید کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"مجھے اُلو بنانے کی کوشش مت کرو منظور ـــــ! میں سب جانتا ہوں کہ آج کل تم کس تتلی کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے ہو ـــــ!!" حمید نے بھی وثوق کے ساتھ کہا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے تم کس کی بات کر رہے ہو حمید ـــــ!" منظور نے انجان بن کر کہا۔

"تو پھر یہ کانسپورہ والی لڑکی سے کیا چکّر چل رہا ہے ـــــ؟" آخر حمید کو ہی یہ راز فاش کرنا پڑا۔

"کانسپورہ ـــــ؟ میں کسی کانسپورہ والی لڑکی کو نہیں جانتا۔ تم کس کی بات کر رہے ہو؟" منظور حیران تھا۔

"ارے وہی جو روز تمہاری دکان کے سامنے سے گزرتی ہے وہیں کسی اسکول میں پڑھاتی ہے۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ حمید بھائی وہ دکاندار تو آتے جاتے مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا ہے کہ میں تو مری جا رہی ہوں ـــــ دیکھا تم نے منظور ـــــ! مجھے تو بنا ڈالا بھائی اور تمہاری بن گئی چھمک چھلّو کیا زمانہ ہے۔"

"اچھّا ـــ تو وہ کانسپورہ کی ہے۔ ہائے کیا لڑکی ہے۔ اور کیا کہتی تھی ـــ؟"
منظورؔ کا اضطراب بڑھ جاتا ہے۔"کیا نام ہے اُس کا ـــ؟" منظورؔ نے بے چینی ظاہر کی۔

"عالیہ ـــ، عالیہ ہے اُس کا نام ـــ"، حمیدؔ بولا۔

"عالیہ ـــ!! تم نے تو مجھے گھائل کر دیا۔" منظورؔ نے ایک قہقہہ لگایا۔

"اِس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ صحیح تھا تم دونوں پہلے سے ہی ایک دوسرے پر قربان ہو رہے ہو۔"، حمیدؔ مسکراتا ہوا چلا گیا۔

منظورؔ خوش تھا بہت خوش۔ جیسے ساری دنیا کی خوشیاں اُسے مل گئی ہوں وہ سوچنے لگا کہ اب مجھے دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ اور ایک عزم کے ساتھ اُٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

دوسرے روز منظور نے اپنا قاصد عالیہ کی خدمت میں بھیجا ـــ قاصد اقرار کی شکل میں ایک محبّت نامہ لے کر آیا جس کی مختصر عبارت کچھ یوں تھی۔

"میرے محبوب!

خدا آپ کو سلامت رکھے۔ روز آپ سے چاہتی تھی کہ بات کروں لیکن اظہارِ محبت کرتے ہوئے ڈرتی تھی اور دل ہی دل میں آپ پر مرتی رہی۔ محبّت کا اظہار کر کے آپ نے میری مشکل آسان کر دی۔ میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں اور اب ملنا چاہتی ہوں، کب، کہاں اور کیسے یہ آپ کو طے کرنا ہے۔ میری دعا ہے کہ مستقبلِ قریب میں ہم ایک ہو جائیں۔ آمین ـــ پیار کے ساتھ

آپ کی عالیہ"

خط پڑھ کر تو اُس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان تصوّر کر رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب عالیہ سے جلد شادی کر کے گھر بسا لوں گا۔ عالیہ کی شکل میں اُسے اُس کے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی جس کی اُسے ایک

مدّت سے تلاش تھی۔

روز ملاقاتیں ہونے لگیں، قسمیں وعدے ہوئے، وفا کے پیمانے چھلکنے لگے۔ زیست کی ساری تلخیاں حلاوتوں میں بدل گئیں۔ دن عید اور راتیں شبِ بارات بن گئیں، پرانی یادیں دل سے نکل گئیں اور نئی آرزوئیں آباد ہوگئیں۔ عالیہ خوب صورت تھی، جوان تھی اُس کے پیار میں منظور سب کچھ بھول گیا۔ دن گزرتے رہے اور ملاقاتوں کا سلسلہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ وقت کا پنچھی تیز رفتاری سے اڑنے لگا۔

چھ مہینوں کی اس طویل مدّت کے دوران ایک بھی دن ایسا نہیں گزرا جس دن اُن کے مابین ملاقاتیں نہ ہوئی ہوں۔ وہ روز ملتے رہے باتیں کرتے رہے پیار کی عشق و محبّت کی اور آنے والے کل کی باتیں۔ اور پھر بہار کا موسم بیت گیا۔ خزاں نے اپنا رنگ دکھایا۔ سارے عالم پر ناخوشگواری کی چادر سی پھیل گئی۔

سرمائی چھٹیوں کے سلسلے میں اسکول تین مہینے کے لیے بند ہوئے اور اُن کی ملاقات کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ یہ مدّت اگرچہ دونوں کے لیے پریشانی کا سبب تھی مگر منظور کے لیے تو قیامت خیز ثابت ہوئی۔ عالیہ سے ملے بغیر اُسے چین ہی کب تھا اُس کی جُدائی وہ برداشت نہ کر سکا کچھ دن تو زہرِ جُدائی کے گھونٹے پیتا رہا لیکن پھر بیماری ایسی حملہ آور ہوئی کہ وہ سنبھل نہ سکا۔ آنکھیں پتھرا گئیں، دل ڈوبنے لگا مگر اس دوران عالیہ کی دید تو درکنار اس کا کوئی خط بھی نہ ملا۔ لیکن وہ اس امید کے سہارے سانس لیتا رہا کہ عالیہ اُسے دھوکا نہیں دے گی وہ نہیں تو اس کا خط ضرور آئے گا۔ اُسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اُن کا ملن ضرور ہوگا ۔۔۔ وہ یہی سوچ سوچ کر اپنے دل کو تسلّیاں دیتا رہا، اور وہ صبر کا زمانہ آخر گزر گیا۔ موسمِ سرما کی چھٹّیاں اختتام کو پہونچیں تعلیمی ادارے از سرِ نو کھل گئے۔ عالیہ کا اسکول بھی کھل گیا ۔۔۔ منظور کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اُسے عالیہ کا شدّت سے انتظار تھا۔ مگر عالیہ کی تو پرچھائی بھی نظر نہ آ رہی تھی۔ وہ حیران و پریشان چاروں

طرف حسرت و یاس بھری آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ ہر ایک سے اس کے بارے میں پوچھتا رہا مگر جو چلے جاتے ہیں اُن کا واپس آنا محال ہوتا ہے۔ مسلسل انتظار کے بعد اُسے یہ ماننا ہی پڑا کہ عالیہ بھی اوروں کی طرح اُسے چھوڑ کر چلی گئی۔ لیکن اُس کا دل اُس کی ایک جھلک کے لیے بے قرار تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بار عالیہ سے ملاقات کر کے وہ اُس کی بے وفائی کا سبب معلوم کرلے۔ اِس ارادے کے ساتھ آخری کوشش کے طور پر وہ اُس چوٹی پر پہنچ گیا جہاں سے ایک تنگ راستہ عالیہ کے گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ پھر اس نے ایک عمر رسیدہ شخص کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ یہ اُسی گاؤں کا باشندہ ہے۔ اس شخص سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ عالیہ کی شادی بہت پہلے ہو چلی ہے۔ اور تب اُسنے اپنا آخری خواب ریزہ ریزہ ہوتے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، دنیا اُس کی نظروں میں ویران ہو گئی۔ زمین اُسے پیروں کے نیچے سے کھسکتی ہوئی محسوس ہونے لگی، آسمان جیسے گرنے لگا۔ اُس کے ہوش وحواس گم ہو گئے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح دوڑنے لگا اور دوڑتا گیا۔ اُسے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ دوڑتے دوڑتے وہ بے حال ہو گیا اور اچانک ایک پتھر سے اس کا پیر پھسلا اور وہ پانچ سو فٹ کی بلندی سے لڑکھڑاتا ہوا نیچے گر پڑا اور سنسان گھاٹی میں دل ہلا دینے والی چیخ کی آواز گونج اٹھی۔ اور وہ جنم جنم کا پیاسا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سیراب ہو گیا۔

زمین سکتہ کے عالم میں یہ تماشہ دیکھ رہی تھی اور آسمان خون کے آنسو بہا رہا تھا ——!!

ختم شد

مُصنّف کی دوسری کتابیں

جُرمِ محبّت	ناول
یادوں کے پھول	اردو افسانوں کا مجموعہ
وہ لمحے جو بیت گئے	ناول
سرُود	شعری مجموعہ (کشمیری)
اندھیری رات	ناول (زیرِ طبع)
وفا کے موتی	ناول (زیرِ طبع)
رٔنگہٕ تہٕ رنگ	شعری مجموعہ (کشمیری)
آش تہٕ اوٚش	افسانوی مجموعہ (کشمیری)